تحقیق و انصاف کی عدالت میں

ایک مظلوم مُصلح کا مُقدمہ

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

سیّد احمد شہید اکیڈمی ○ لاہور

تحقیق وانصاف کی عدالت میں

یعنی

ایک مظلوم مُصلح کا مُقدمہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

سیّد احمدؒ شہید اکیڈیمی ○ لاہور

286.3

481

نام کتاب : تحقیق و انصاف کی عدالت میں

مؤلف : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اشاعتِ اوّل : صفر المظفر ۱۳۹۹ھ مطابق جنوری ۱۹۷۹ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : غیر مجلّد-/۶ روپے، مجلّد-/۱۲ روپے

مطبع : شرکت پریس لاہور

بسعی و اہتمام : سید احمد شہید اکیڈمی
۱۷۷/۳ کریم پارک لاہور

ملنے کے پتے

و مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ۔ ۳۲۔اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور
و مکتبہ رشیدیہ، غلہ منڈی ساہیوال

خطاطی : محمد جمیل حسن تلمیذ حضرت سید نفیس رقم صاحب لاہور

فہرست

کچھ کتاب کے بارے میں ۵

پیش لفظ ۸

تحقیق و انصاف کی عدالت میں ۱۷

رائے بریلی کی تربیت گاہ سے بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ۱۹

مجاہدین برطانوی حکومت کے مقابلے میں ۲۵

حیرت انگیز تربیت اور تنظیم ۲۷

برطانوی حکومت کی انتقامی کارروائی اور جماعت کی بے نظیر استقامت ۳۰

امکانی تدبیر اور مناسب حکمت عملی ۳۲

تجدید و احیاء کے چند عظیم کارنامے اور انقلابی اصلاحات ۳۴

ہمہ گیر اور دُور رس اثرات ۴۲

مغربی مصنّفین کا معاندانہ اور غیر ذمہ دارانہ رویّہ [illegible]

معروف زندگی، محفوظ تاریخ [illegible]

عناد و تعصب کے چند نمونے ۵۲

مغربی مصنّفین کے مشرقی خوشہ چیں ۵۴

بعض اکابر معاصرین کی شہادتیں ۵۷

بعض مغربی مصنّفین کا اعترافِ حق ۶۳

نائب رسولؐ و امامِ کامل ۶۵

D6852

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ کتاب کے بارے میں

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد:

۱۹۷۶ء میں جب مجتبیٰ محی الدین احمد صاحب اپنی قابلِ قدر انگریزی تصنیف [SAIYID AHMED SHAHID HIS LIFE AND MISSION] کی ترتیب سے فارغ ہوئے تو اُنھوں نے مجھ سے اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ یہ فرمائش ہر طرح میرے ذوق و جذبہ سے مطابقت رکھتی تھی، میں نے اس وقت اس کتاب کے لیے ایک بسیط مقدمہ لکھا جس میں خاص طور پر مغربی مصنّفین کے اس معاندانہ اور انتہائی غیر ذمّہ دارانہ رویّہ کا شکوہ اور اس کے خلاف علمی و قلمی احتجاج تھا جو انھوں نے سیّد صاحب کی سیرت و تحریک کے بارے میں متّفقہ طور پر اختیار کر رکھا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ ان کے لیے اس شخصیت اور اس عظیم تحریک کے ساتھ انصاف کرنے کی راہ میں مواد کی کمی یا صحیح معلومات کی نایابی کے قسم کی کوئی مجبوری حائل نہ تھی جو ان شخصیتوں یا تحریکوں کی سیرت نگاری یا تاریخ نویسی کے سلسلہ میں حائل ہوا کرتی ہے جن کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوتا ہے یا جن کے گرد افسانوں اور

کہانیوں کا جال پھیلا ہوتا ہے۔ یہ مقدمہ کتاب کے ساتھ شائع ہُوا اور اس کی اُردو اصل بھی بعض رسالوں میں شائع ہوئی۔

مقدمہ نگار کی نظر اس کے بعد ان بعض عربی کتابوں اور رسائل پر پڑی جن میں اصلاً یا ضمناً سیّد صاحبؒ کا تذکرہ تھا، تو یہ دیکھ کر حیرت ہُوئی کہ ان کی بنیاد بھی تمام تر مغربی مُصنّفین کی کتابوں اور بیانات پر ہے۔ ان مسلمان عرب مصنّفین نے خود تحقیق و انصاف کرنے کی (جس کے ذرائع ان کو بآسانی میسّر تھے) کوئی کوشش نہیں کی، یہ دیکھ کر دل پر چوٹ لگی اور اس مقدّمہ کو تکمیل و اضافہ کے بعد مستقل رسالہ یا کتاب کی شکل میں شائع کرنے کی ایسی پُرزور تحریک پیدا ہوئی کہ راقم اُس وقت تک کوئی دُوسرا تحریری کام نہ کر سکا جب تک اُس نے اس تحریر اور قلبی تقاضے کی تکمیل نہیں کرلی، یہ رسالہ عربی میں لکھا گیا جس میں اس انگریزی مقدمہ کو نئے اضافوں اور نئی ترتیب کے ساتھ تحلیل کرلیا گیا۔ یہ رسالہ اسی سال ۱۹۷۸ء میں ندوۃ العلماء کے عربی مطبع میں چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچا۔ مصنّف نے اس کا نام "ألإمام الذى لم يوفّ حقه من الإنصاف والاعتراف" (وہ عظیم شخصیت جس کے ساتھ پُورے انصاف و اعتراف کا معاملہ نہیں کیا گیا) رکھا۔ اس کا دُوسرا اڈیشن قاہرہ کے "دار الاعتصام" سے دس ہزار کی تعداد میں شائع ہُوا، اور دیکھتے دیکھتے عرب ممالک میں پھیل گیا۔

مصنّف نے جب خود اس پر نظر ڈالی تو اس کو محسوس ہُوا کہ اس موضوع پر ایک مؤثر اور طاقتور تحریر تیار ہوگئی ہے۔ اس میں سیّد صاحبؒ کی سیرت اور اُن کی دعوت و تحریک کے ہزاروں صفحات کا عطر آگیا ہے اور اس کا مطالعہ اس زمانہ کے قلیل الفرصت اور سُرعت پسند قارئین کے لیے بہت مُفید ہوگا۔ اس نے اپنے برادر زادۂ عزیز مولوی سیّد محمد الحسنی سلمہٗ (مدیر البعث الإسلامي، عربی) سے جو اس کی عربی تصنیفات کے سب سے

بڑے مترجم ہیں، خواہش کی کہ وہ اس کا ترجمہ کریں۔ انھوں نے حسبِ معمول بڑی خوبی اور روانی کے ساتھ اس کے ترجمہ کا فرض انجام دیا۔ ترجمہ پر نظرِ ثانی کرتے وقت اس میں ضروری ترمیم و اضافہ سے کام لیا گیا۔ اس طرح یہ اُردو ایڈیشن زیادہ مفید اور طاقتور بن گیا، اور اب وہ اُردو میں ایک مستقل کتاب بن گئی۔

مصنّف نے اس کا نام "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" تجویز کیا جس میں کتاب کی اصل رُوح اور اس کا مقصد پُورے طور پر آگیا۔ اب یہ کتاب اس نام کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔ اُمید ہے کہ دلچسپی اور اثر پذیری کے ساتھ پڑھی جائے گی، اور اپنے اس مقصد کو پُورا کرے گی جو اس کی تالیف کا محرک تھا۔ وما التوفيق إلا من عند الله۔

ابُو الحسن علی

۳۰ رشعبان ۱۳۹۸ھ
۶ ر اگست ۱۹۷۸ء
دائرۂ شاہ علم اللہؒ، رائے بریلی

پیش لفظ

الحمد للہ رب العلمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النّبیین محمّد واٰلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان الیٰ یوم الدین۔

شہدائے اسلام، اصحابِ دعوت وعزیمت اور ملّتِ اسلامی کے وہ پاک دِل و پاکباز سرفروش جن کی زِندگی کا ایک ایک لمحہ رضائے اِلٰہی کے لیے وقف تھا، جنھوں نے راہِ خُدا میں بہ ع "نہ ستائش کی تمنّا نہ صِلہ کی پروا" کے اصول پر عمل کرتے ہُوئے بے دریغ اپنی جانیں قربان کیں۔ جو دُنیا اور آلائشِ دُنیا سے ہمیشہ کے لیے اپنا دامن جھاڑ چکے تھے اور اس کو نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی اُنھیں گوارا نہ تھا ان کو اس کی بالکل ضرورت نہیں کہ آنے والی نسلیں اُن کے کارناموں اور خدمات کا اعتراف کریں۔ مؤرّخ اور اہلِ قلم اُن کی داستانیں سُنائیں، ادباء وشعراء اُن کے نغمے گائیں، سلاطین واُمراء اُن کی یادگاریں قائم کریں اور اُن کا نام زندہ رکھیں۔ اِس لیے کہ وہ آج خُدا کے جوارِ رحمت میں اُس کی عطا کی ہُوئی لافانی عزّت سے سُرخرو اور مسرور وشاداں ہیں، وہ اس ربّ شکور کے پاس ہیں جو اُن کی مخلصانہ جدّوجُہد کا بہتر سے بہتر صِلہ ان کو عطاء فرما سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي
لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ
مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ أُنْثٰى بَعْضُكُمْ
مِّنْ بَعْضٍ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا
وَأُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ
اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقَاتَلُوْا وَ
قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ
وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ج ثَوَابًا
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط وَ اللّٰهُ
عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ

(آل عمران - ۱۹۵)

سو منظور کر لیا اُن کی درخواست کو اُن
کے رب نے اس وجہ سے کہ میں کسی شخص
کے کام کو جو کہ تم میں سے کام کرنے والا
ہو، اکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا
عورت، تم آپس میں ایک دُوسرے کے
جُز ہو سو جن لوگوں نے ترکِ وطن کیا اور
اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیف
دیے گئے میری راہ میں جہاد کیا اور شہید
ہو گئے ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف
کر دُونگا اور ضرور اُنکو ایسے باغوں میں
داخل کرونگا جن کے نیچے نہریں جاری
ہونگی۔ یہ عوض ملے گا اللہ کے پاس سے
اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔

اللہ کے ان مخلص اور پاک نہاد بندوں کو اگر اس کا اختیار دیا جاتا کہ وہ شہرت و ناموری اور اخفاءِ حال اور گمنامی میں جس کو چاہیں پسند کرلیں تو وہ یقیناً اخفاءِ حال اور گمنامی کو ترجیح دیتے اور اللہ تعالیٰ سے پُوری اِلحاح و زاری کے ساتھ دُعا کرتے کہ اُن کے اس عمل کو خالص اپنی رضا کے لیے محفوظ و مستور رکھے اور کسی انسان کو اس کی خبر نہ ہو۔ ان مردانِ خدا میں بہت سے ایسے تھے کہ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کے کسی عمل اور خدمت کا عامۃ الناس میں چرچا ہو گیا ہے تو ان کو اس سے رنج ہوتا، اگر کسی وقت اضطراری طور پر یا کسی کیفیت و حال کے غلبہ سے اُن کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل جاتی

جس سے اُن کے اس کارنامہ کا علم ہو جاتا تو وہ اس پر نادم ہوتے اور ان کو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا ان کا کوئی راز فاش ہو گیا ہے۔ امام بخاریؒ حضرت ابُو ہریرہؓ کے حوالہ سے حضرت ابُو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں نکلے، ہم لوگ چھ آدمی تھے اور صرف ایک اونٹ ہمارے درمیان تھا، جس پر ہم لوگ باری باری سوار ہوتے تھے، اس کی وجہ سے ہمارے پیر زخمی ہو گئے اور میرا پیر بھی زخمی ہُوا اور جگہ جگہ سے کھال پھٹ گئی، میرے ناخن بھی گر گئے، چنانچہ ہم لوگوں نے اپنے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لیے، اسی لیے اس کا نام غزوۂ "ذات الرقاع"[1] (پٹیوں والا غزوہ) پڑ گیا۔ اس لیے کہ ہم نے اپنے پیروں پر پٹیاں اور چیتھڑے لپیٹ لیے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے بیان تو کر دیا، پھر ان کو یہ بات کھٹکی اور اُنھوں نے کہا کہ مجھے یہ بیان نہ کرنا چاہیئے تھا، گویا اُنھوں نے یہ پسند نہ کیا کہ اُن کا یہ عمل لوگوں میں مشہور ہو۔

اِس لحاظ سے اگر لوگ اُن کو نہیں پہچانتے یا آنے والی نسلیں اُن کے اعتراف سے قاصر رہتی ہیں یا زمانہ اُن پر گمنامی کا پردہ ڈال دیتا ہے تو حقیقتاً اس سے ان کا کوئی نقصان نہیں، اس لیے کہ جس ذاتِ عالی کے لیے اُنھوں نے یہ قربانیاں دی تھیں، اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا، وہ ان سے پُوری طرح باخبر ہے، اس سلسلہ میں "معرکۂ نہاوند"[2] کا ایک واقعہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے اور اس سے اس اندازِ فکر اور مزاج و مذاق پر روشنی پڑتی ہے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ نہاوند کے معرکہ میں چند روز بڑے سخت گزرے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ ذات الرقاع۔

[2] ایران کا ایک شہر جہاں (سنہ ۲۱ھ ب ۶۴۲ء) میں یہ مشہور معرکہ پیش آیا تھا۔

نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور مسلمانوں کے امیر نے امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو فتح کی بشارت بھجوائی اور ساتھ ہی نعمان بن مقرن رضؓ (جو اس جنگ میں مسلمانوں کے سپہ سالار تھے) کی شہادت کی اطلاع بھی دی۔ حضرت عمرؓ یہ سُن کر بے ساختہ رو دیئے اور اِنّا لِلّٰہِ پڑھا پھر پُوچھا اور کون کون شہید ہُوا؟ قاصد نے نام بتانے شروع کیے اور بہت سے لوگوں کے نام لیے پھر یہ کہا کہ اے امیر المومنین ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں جن کو آپ نہیں جانتے! حضرت عمرؓ نے روتے ہُوئے کہا، اگر عُمر نہیں جانتا تو اُن کا کیا نقصان ہے اللہ تعالیٰ تو اُن کو جانتا ہے[1]

لیکن انسان کی فطرتِ سلیم اور ذوقِ صحیح کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ محسن کا احسان مانے فضل و کمال کا اعتراف کرے اور ہر اس شخص کا احسان تسلیم کرے جس نے اس کے ساتھ یا اس کی ملت اور مُلک کے ساتھ کوئی خیر خواہی کی ہو اور اس ملت و قوم کے مذہب و عقیدے یا وطن کی پاسبانی و حفاظت کے لیے جان دی ہو، دُنیا کی تمام وہ قومیں جن کو فطرتِ سلیم اور اور ذوقِ صحیح کا کچھ حصّہ ملا ہے، اپنے رہنماؤں اور محسنوں کے کارناموں کو مختلف صورتوں اور طریقوں سے جو اُن کے یہاں رائج و معروف ہیں زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں اس کے پیچھے یہی احسان شناسی، اعترافِ حق کا جذبہ، نئی نسل کو اُن کے کارناموں سے آگاہ کرنا اور اُن کی ہمت افزائی اور اُن کے اندر عالی ہمتی اور اولوالعزمی کے صفات پیدا کرنے کا داعیہ ہوتا ہے "گمنام سپاہی" (UN KNOWN SOLDIER) کی یادگار باقی رکھنے اور اس کے اعزاز و اکرام کی مختلف صورتیں اختیار کرنے کی روایت جو مغربی قوموں میں عام ہے اسی احساس کا نتیجہ اور اسی جذبۂ قدر شناسی کی تصویر ہے۔

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۳۵

مسلمانوں اور انبیاء علیہم السلام کے ماننے والوں میں احسان شناسی اور شکر و اعتراف کا یہ شریفانہ جذبہ دنیا کی ہر قوم اور ہر جماعت سے بدرجہا زائد ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے اس وصفِ خاص اور اپنے پیشرو بزرگوں اور محسنوں کے لیے دعائے خیر کے معمول، ان کی فضیلت و سبقت کے اعتراف کا ذکر کیا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا
وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا
بِالْاِيْمَانِ، وَلَا تَجْعَلْ فِيْ
قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔
(سورۂ حشر۔ ۱۰)

جو ان کے بعد آئے وہ ان مذکورین کے
حق میں دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے
پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے
بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے
ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں
کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے، اے
ہمارے پروردگار آپ بڑے شفیق و رحیم ہیں

اس کے بالمقابل اس نے کفار اور اہلِ جہنّم کی ناشکری کی عادت، انکے احسان فراموشی کے مزاج، اپنے پیشرووں پر لعنت و ملامت اور اُن سے اظہارِ نفرت و کراہت کی تصویر بھی پیش کی ہے۔ چنانچہ جہاں جہنّم کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہاں اہلِ جہنّم کے متعلق آیا ہے:

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ
اُخْتَهَا

جب کوئی جماعت اس میں آتی ہے تو
پہلی والی جماعت پر لعنت بھیجتی ہوئی آتی ہے

اُمتِ مسلمہ خاص طور پر فراخدلی و عالی حوصلگی، اعترافِ کمال، روحِ انصاف و اعتدال اپنے بزرگوں کے کارناموں اور ان کی علمی و عملی میراث کی قدر و حفاظت، نیز ان کیلئے دعاؤں کے خصوصی اہتمام میں دوسری قوموں سے ممتاز ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت سیرتِ نبویؐ اور تاریخ و سوانح کا وہ عظیم و لازوال ذخیرہ ہے جس کی نظر اپنی کیفیت اور کمیت

دونوں اعتبار سے دُنیا کی کسی اور قوم اور ملک میں نہیں ہے اور جس نے اس موضوع پر ایک پُوری لائبریری تیار کر دی ہے۔

تاہم اس اہتمام و دلچسپی، دیدہ وری اور دقیقہ سنجی، ذوقِ جمال اور اعترافِ کمال اور اپنی مایۂ ناز و سرآمد روزگار شخصیتوں کے تعارف اور احسان شناسی و منت پذیری کے باوجود اب بھی متعدد شخصیتیں اس وسیع مرقّع یا البم میں اپنی صحیح جگہ حاصل نہیں کر سکیں اور ابھی اُن کے کارناموں اور خدمات کو پُوری طرح اجاگر اور روشن نہیں کیا گیا یا ان کے ساتھ حق تلفی کا معاملہ ہُوا، اور ان کو وہ انصاف و اعتراف نہ مل سکا جو ملنا چاہیئے تھا۔ اس کے علاوہ ان کو مصنوعی داستانوں، بے سروپا افسانوں اور غلط افواہوں نے اس قدر گھیر لیا کہ ان کی اصل شخصیت اس میں چُھپ گئی۔

دُوسری چیز جس نے اُن کا ازسرِنو جائزہ لینے، مطالعہ کرنے اور ان کی گہرائیوں تک پہنچنے اور ان کی سیرت و کردار کی "کلید" کو صحیح طور پر سمجھنے میں ایک بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی ہے وہ ناقص و ناتمام مباحث اور خام تحقیقات ہیں۔ یہ "نیم علم" یا "علمِ ناقص" اکثر اوقات "جہلِ کلی" سے زیادہ مُضر ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ "علمِ ناقص" حجاب بن جاتا ہے اور انسان کی راہ مارتا اور راستہ کھوٹا کرتا ہے۔ اس کے برعکس جہالت و ناواقفیت اس کو علم کا شوق دلاتی اور آگے بڑھنے اور اسرار کی پردہ کشائی کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس ناقص اور ادھورے علم نے انسان کو حقائق تک رسائی اور طویل و عمیق مطالعہ اور تحقیق و جستجو سے اکثر باز رکھا ہے۔

مُجاہدِ کبیر، مجدّدِ اسلام حضرت سیّد احمد شہیدؒ ہماری طویل و عریض تاریخ کے ان یگانہ و منتخب افرادِ اُمّت میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان و احتساب، رضائے الٰہی و ثوابِ اُخروی کے شوق و یقین کی دولتِ خاص سے نوازا تھا اور ریا و حبِّ جاہ کی آلائشوں سے ان کے دلوں کو پُوری طرح پاک و صاف کر دیا تھا اور جن کی نگاہ میں دُنیا اور اس کی زیب

زینت اور جاہ و منصب کی قیمت مور و مگس اور خار و خس سے زیادہ نہ تھی۔ ایک موقع پر جب سیّد صاحبؒ حج کے لیے تشریف لے جا رہے تھے، کلکتہ کے ایک بہت بڑے تاجر نے آپ سے عرض کیا کہ آپ جس جہاز سے جا رہے ہیں وہ بہت معمولی قسم کا جہاز ہے مناسب یہ ہے کہ آپ "عطیۃ الرحمان" نامی جہاز سے تشریف لے جائیں اس لیے کہ اس پر ساٹھ ضرب توپ چڑھی ہے۔ محمد حسین ترک اس کا ناخُدا ہے اور وہ چالیس جہازوں کا کپتان ہے۔ آپ اس پہ سوار ہوں جس وقت آپ ملک عرب میں پہنچیں گے وہاں کے لوگ آپ کی عزّت و حُرمت کریں گے۔

یہ سُن کر آپ کا چہرۂ مبارک غصہ سے متغیّر ہو گیا، فرمایا کہ غلام حسین خاں! یہ تم نے کیا کہا۔ عزّت و حُرمت تو خدا کی طرف سے ہوتی ہے، بندے کی طرف سے نہیں۔ ہم دُنیا کی قدر و منزلت کو ایسا جانتے ہیں جیسا سڑا کتّا[1]

اِسی قدر و اخلاص اور اہلِ دُنیا کی تعظیم اور شہرت و ناموری سے اجتناب اور کراہت کی وجہ سے انھوں نے یہ دُعا کی کہ مرنے کے بعد اُن کی قبر کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ چنانچہ یہ دُعا پوری ہُوئی اور اس کا یہ اندیشہ ہی نہ رہا کہ ان کی قبر زیارت گاہِ خلائق بنے۔

اِس لحاظ سے ان کو تو اس کی حاجت نہیں کہ نئی نسل، تعلیم یافتہ طبقہ، اہلِ قلم، اصحابِ علم، تاریخِ اسلام کے نقشہ، اور دین کی نشاۃِ ثانیہ اور اصلاح و تجدید کے اہم شعبے میں ان کی دعوت اور تحریکِ جہاد کا مقام و مرتبہ متعیّن کریں اور یہ محسوس کریں کہ نہ صرف اپنے عہد و ماحول بلکہ غیر منقسم ہندوستان اور قریب کے ممالکِ اسلامیہ میں دینی جدّوجُہد و خدمت اور اشاعتِ اسلام میں اس تحریک کے کیا اثرات تھے، ہاں ہماری موجُودہ نسل اور آئندہ نسلوں نیز اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو اس کی ضرورت بلاشبہ ہے کہ اس کو تحقیق و انصاف کے

---

[1] وقائع احمدی ص ۱۰۸۷، ص ۱۰۸۸

ساتھ از سرِ نو مرتب کیا جائے اور اس کی اہم شخصیات کو صحیح مقام پر رکھا جائے اور ان کا پُورا حق ادا کیا جائے، یہ عظیم علمی و تحقیقی کام ہمارے اوپر قرض ہے اور مناسب ہوگا کہ ہم جلد اس سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

یہی احساس تھا جس نے راقم سطور کو ادائے فرض اور شہادتِ حق کے طور پر عالمِ اسلام میں اس عظیم شخصیت کے تعارف پر آمادہ کیا، بعض مخصوص حالات و مواقع کی وجہ سے جو اس کے بہت سے معاصر اہلِ قلم کو (ان کی فضیلتِ علمی کے پورے اعتراف کے ساتھ) حاصل نہ تھے اس کو ان کی سیرت و کارناموں کے خصوصی مطالعہ اور ان کی عظمت کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف توجہ کا موقعہ ملا۔ آغازِ شعور ہی سے اس نے اس موضوع پر سوچنا، پڑھنا اور لکھنا شروع کر دیا۔ تاریخِ اصلاح و تجدید و دعوت و عزیمت کے موضوع سے اشتغال رکھنے کی وجہ سے اس کو طبقاتِ رجال کو سمجھنے اور فکرِ اسلامی اور جہاد و عمل کی تاریخ میں اُن کی جائز اور موزوں جگہ متعیّن کرنے میں بہت مدد ملی اور کام میں آسانی ہُوئی۔

ان سب باتوں نے اس کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے عزیز دوستوں کے سامنے بھی اس امامِ وقت کی سیرت اور کارناموں کا ایک نمونہ اختصار کے ساتھ پیش کرے جو آگے چل کر (اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال رہی تو) کسی خوش نصیب کے لیے زیادہ مفصّل اور مکمّل کام کی بنیاد بھی بن سکتا ہے۔

یہ مختصر صفحات جو آپ کے مطالعہ میں آئیں گے، اسی سمت میں ایک حقیر کوشش یا پہلا قدم ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والے اہلِ علم اور مصنّفین و مؤرخین کے لیے اس میں سامانِ نظر بھی ہے اور اسلام کی سربلندی اور نئے عہد کی ترقی یافتہ جاہلیت کے مقابلہ میں، (جس نے آج عالمِ اسلام کو اپنے نرغہ میں لے رکھا ہے) نیا خون اور نئی رسد فراہم کرنے کی صلاحیت بھی۔ وذكر فان الذكرى تنفع المؤمنين۔

تاریخِ دعوت و عزیمت کا یہ درخشاں و تابناک صفحہ جس پر غلط فہمیوں اور ناقدریوں کی گرد پڑ گئی ہے اور تجدیدِ دین و احیائے اسلام کی یہ ولولہ انگیز اور ایمان افروز داستان (جو نیم فراموش شدہ ہے) مسلمانوں کی نئی نسل سے اقبال کے الفاظ میں اس طرح مخاطب ہے۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہؒ
رائے بریلی

تحقیق و انصاف کی عدالت میں

ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ

اِصلاح و تجدید کا وسیع ترین محاذ

حضرت سیّد احمد شہیدؒ (سنہ ۱۲۰۱ھ – ۱۲۴۶ھ) نے اس تحتی برِّ اعظم میں جس عظیم اسلامی تحریک کی رہنمائی کی اس کی نظیر جامعیت، قوتِ تاثیر اور اسلام کی اولین دعوت اور طریقِ نبوت سے قرب و مناسبت میں نہ صرف تیرہویں صدی میں ہمیں نظر نہیں آتی ہے، جو اس کا عہد ہے بلکہ گذشتہ کئی صدیوں میں بھی اس جیسی ایمان آفریں تحریک اور صادقین و مخلصین کی ایسی مربُوط و منظّم جماعت کا کوئی سراغ نہیں ملتا، وہ عقائد و اعمال کی تصحیح، افراد کی تربیت وعظ و تبلیغ اور جہاد و سرفروشی کے وسیع و طویل محاذ پر جس طرح سرگرمِ عمل رہے اس کا اثر صرف ان کے میدانِ کارزار اور ان کی معاصر نسل تک محدود نہ رہا بلکہ اس نے آئندہ نسل، اپنے بعد آنے والے اہلِ حق، اصحابِ دعوت اور دین کے علمبرداروں اور خادموں پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے۔ بڑھتے ہوئے انگریزی اقتدار کے مقابلہ کی اور ہندوستان اور اس کے پڑوسی مُسلم ممالک کی حفاظت کی جدّ و جُہد کی ابتدا بھی آپ ہی نے کی، اس تحریک اور جدّ و جُہد

کی زمام قیادت ہندوستان میں اوّل اوّل انھیں کی جماعت کے علماء اور قائدین کے ہاتھ میں رہی۔ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ و نشر و اشاعت کی جدید تحریک (جس نے اس وسیع و عمیق خلیج کو پُر کیا جو مسلم عوام اور صحیح اسلامی تعلیمات اور کتاب و سنّت کے درمیان پائی جاتی تھی) انھیں کی کوششوں کی رہینِ منّت ہے۔ مسلمانوں کی دینی و سیاسی بیداری بلا واسطہ اسی دعوت و تحریک کا نتیجہ اور ثمرہ ہے جس نے مسلمانوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اچانک بیدار کر دیا اور ان کے اعصاب و احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس تحریک کے اثرات علم و ادب، فکرِ اسلامی اور زبان و اسالیبِ بیان[1] پر بھی پڑے۔ اس لیے کہ سیّد صاحب اور ان کے رفقاء کی دعوت عوامی تھی جس نے اُردو زبان کو مفاہمت و گفتگو اور خواص و عوام کو عمیق مطالب و معانی سے آشنا کرنے اور اُن کے قلب و دماغ میں ان مطالب کو دلنشین و راسخ کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اس مقصد سے انھوں نے اس زبان کی تسہیل و ترقی اور تراش و خراش کا پورا خیال رکھا اور اس کو فارسی زبان کا قائم مقام بنا دیا جو اس زمانہ میں علم و ادب اور تصنیف و تالیف کی واحد زبان سمجھی جاتی تھی۔ اس میں جو خیال آرائی اور صنعت لفظی شامل ہو گئی تھی اس کا حصّہ بھی اس میں کم کیا گیا اور اس کے نتیجے میں زبان و ادب کا ایک مستقل دبستان وجود میں آگیا۔

---

[1] متعدد ہندوستانی و پاکستانی فضلاء و اہلِ علم نے اس موضوع پر محققانہ مقالے لکھے ہیں اور ہندوستان اور یورپ و امریکہ کی مشہور جامعات میں اس پر لیکچر دیئے ہیں کہ اُردو زبان پر حضرت سیّد احمد شہیدؒ و مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک و جہاد کا کیا اثر پڑا اور اس کی وجہ سے اسالیبِ زبان میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں اور اردو زبان نے کس طرح عوام کو مخاطب و متاثر کرنا سیکھا اور وہ عام فہم اور آسان زبان بنی۔

رائے بریلی کی تربیت گاہ سے بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک

سیّد صاحبؒ نے توحید کے عقیدۂ خالص کی دعوت پر اپنی تحریک کی بُنیاد رکھی اور الا للہ الدین الخالص (دیکھو خالص عبادت صرف خدا ہی کے لیے (زیبا) ہے) کا آوازہ اس جُرأت اور بلند آہنگی سے بلند کیا جس سے دشت وجُبل گونج اُٹھے۔ ہمارے علم میں اس ملک میں اس سے پہلے اس بلند آہنگی سے یہ صدا بلند نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے مسلمانوں میں ایمان ویقین، جذبۂ اسلامی اور جہاد فی سبیل اللہ کی رُوح پھونک دیؔ ایک بڑی جماعت کو داعیانہ اور مجاہدانہ بُنیادوں پر منظم کیا۔ ان کی ایسی مستحکم اور جامع دینی تربیت کی جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط اور حاوی تھی اور جس کی جڑیں ان کے دل و دماغ اور رُوح میں پیوست تھیں۔ ۱۷ر جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ کو مجاہدین فی سبیل اللہ کا یہ قافلہ ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد (پشاور و مردان کے آزاد قبائلی علاقہ) تک جا پہنچا اور اس نے اس علاقہ کو دعوت وجہاد کا مرکز بنایا۔ ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ یہاں سے وہ اپنے کام کا آغاز کریں گے اور انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کر کے اس پورے علاقہ میں کتاب و سنّت کی بُنیاد پر عادلانہ حکومت قائم کریں گے۔ اس کے لیے اُنھوں نے مسلمانوں میں جوشِ ایمانی اور حمیتِ دینی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اہل الرائے اصحابِ اقتدار اور نوابین و اُمرا کو اس خطرہ سے آگاہ کیا جو انگریزی اقتدار کی شکل میں اُن کے سروں پر منڈلا رہا تھا اور جس کی زد میں ہندوستان کے علاوہ برّصغیر کے مرکزِ اسلام اور ممالکِ عربیہ بھی تھے۔ اور جو ان کی

---

[1] اس کا بہترین نمونہ ان کی بلند پایہ کتاب "صراطِ مستقیم" اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "تقویۃ الایمان" ہے، ان دونوں کتابوں سے اُن کے خیالات کا پُورا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

پوری شخصیت اور وجود کو مٹا دینے کے درپے تھا۔ انھوں نے انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور اُن کے توسیع پسندانہ منصوبوں سے بھی اُن کو متنبہ کیا۔ نوابوں اور راجوں مہاراجوں نیز آزاد ممالک کابل، ہرات اور بخارا کے اُمرا سے رابطہ قائم کیا، ان کے پاس اپنے قاصد بھیجے اور ان کو بار بار ایسے مؤثر بلکہ دلدوز اور طاقت و حرارت اور ایمانی غیرت و حمیت سے بھرے ہوئے خطوط لکھے جن میں ایک مومن کامل کی فراست، رہنما اور قافلہ سالار کی عالی ہمتی و اولوالعزمی اور ایک ایسے امامِ وقت اور دینی مُصلح و مربّی کی دلسوزی خلوص اور شفقت (جس کو اللہ تعالیٰ کسی بڑے کام کے لیے تیار فرماتا ہے) صاف جھلک رہی تھی۔ اپنی عالی ہمتی اور دُور اندیشی اور خطرات کے پورے احساس میں وہ نہ صرف اپنے عہد میں صفِ اوّل کے مُدبّر اور ماہرینِ سیاست و امورِ سلطنت سے آگے تھے بلکہ ان کے بعد سیاست دانوں کی رسائی بھی ان بلندیوں تک نہ ہو سکی، جہاں ان کے شہبازِ فکر و عمل نے اپنا آشیانہ بنایا تھا۔

یہ دراصل سُنّتِ نبویؐ کی ترویج اور اسلام کے مٹتے ہوئے نشانات کے احیاء، جاہلیت کے مقابلے میں اسلام اور بدعت کے مقابلے میں سنّت کا پرچم بلند کرنے، مسلمانوں میں احکامِ شریعت کے اجراء اور ان کو دین میں بتمام و کمال داخل ہونے کی دعوت تھی، جس میں کسی سیاسی مفاد، ذاتی مصلحت اور دُنیا میں سربلندی و نام آوری کی خواہش بالکل شامل نہ تھی[1]

ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد تک پہنچنے کے لیے آپ نے صوبجات متحدہ مالوہ کے علاقوں اور راجپوتانہ، مارواڑ، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے ریگستانوں، درّوں جنگلوں

---

[1] ملاحظہ فرمائیے، ان کی کتاب "صراطِ مستقیم" فصلِ پنجم، ضرورتِ جہاد۔ نیز ان کے مکاتیب اور خطوط جو انھوں نے ہندوستان کے حکام و رؤساء و علماء و مشائخ اور سرحد و افغانستان و بخارا و ترکستان کے اہلِ حکومت کو لکھے "سیرت سیّد احمد شہیدؒ" حصہ اول سولھواں باب ص۳۸۵ ، ص۳۹۵

دریاؤں اور دلدلی علاقوں کو طے کیا، جن کو طے کرنا ایک مستقل جہاد تھا، بعض جگہ پانی کی قلت سامانِ خوراک کی کمی، مقامات کی دشوار گذاری، قزاقوں کا خطرہ، بھوک اور پیاس کی شدت، اجنبی قوموں، نئی زبانوں اور نرم گرم مزاجوں کا سامنا کرنا پڑا، آپ نے پورے قافلہ کے ساتھ درۂ بولان کا وہ تنگ اور خطرناک راستہ طے کیا جو افغانستان کے داخلہ کا ایک قدرتی راستہ ہے اور جس کو قدرتِ الٰہی نے اولوالعزم فاتحین کے لیے اس طویل سلسلہ کوہ میں پیدا کر دیا ہے، دراصل یہ ایک طویل اور گہری کھائی ہے جو کوہِ براہٹک (BRAHTUICK) کو کاٹتی ہوئی چلی گئی ہے۔ دونوں طرف بلند پہاڑوں کی فلک پیما دیواریں ہیں جن کی بلندی سطح سمندر سے پانچ ہزار سات سو فٹ تک ہے۔ اس درّہ کی چوڑان بالعموم چار پانچ سو گز کے درمیان ہے اس کے بعد کوزک کا وہ تنگ اور مہیب درّہ واقع ہے جو قندہار سے قبل، جبل توبہ سے ہو کر گزرتا ہے۔

قندہار، غزنی اور کابل میں آپ کا جس طرح شاہانہ استقبال کیا گیا ایسا استقبال طویل عرصہ سے کسی حاکمِ وقت یا ملکی رہنما اور عالمِ دین کا نہیں ہوا تھا۔ یہ پورا علاقہ سرکاری و غیر سرکاری ہر سطح پر ان کے استقبال کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس استقبال و بے مثال خیر مقدم میں جوشِ ایمانی بھی تھا اور افغانیوں کی کریم النفسی اور جذبۂ مہمان نوازی بھی، ان کی امنگیں اور آرزوئیں اور موجودہ حالات سے ان کی بے اطمینانی بھی، ان کو اپنی تاریخ کے اس اہم دور میں ایک ایسی مخلصانہ قیادت کی ضرورت تھی جو ان کی از سرِ نو شیرازہ بندی کرسکے خاندانی و قبائلی حکومتوں سے ان کو نجات دلائے اور ان کی طاقتوں اور صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرے جن سے کام لے کر انھوں نے بارہا اس ملک کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا لیکن اسلام کی نعمت سے مالامال اور خونِ شہادت سے لالہ زار کیا تھا۔

وہاں سے آپ پشاور اور ہشت نگر تشریف لے گئے۔ یہاں بھی وارفتگی اور محبت

کے وہی مناظر سامنے آئے جو اس پورے سفر میں دیکھے جارہے تھے۔ ہشت نگر میں چند دن قیام کرتے ہوئے اور مسلمانوں کو جہاد کے لیے تیار کرتے ہوئے آپ نوشہرہ تشریف لے گئے اور یہاں سے جہاد جیسے محبوب عمل اور عظیم عبادت کا آغاز فرمایا جو برسوں کی دعوت و تبلیغ اور جدوجہد کا ماحصل اور اس پُرمشقت سفر کا مقصد تھا۔ نوشہرہ سے آپ نے رنجیت سنگھ کو ایک اطلاع نامہ بھیجا جس میں سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی گئی ورنہ جزیہ دینے اور اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ان دونوں مطالبوں کو قبول نہ کرنے کی صورت میں جنگ کی اطلاع دی گئی تھی۔

۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ میں آپ نے بیعت امامت لی۔ آپ کے نام سے جمعہ کا خطبہ پڑھا گیا اور لوگ کثیر تعداد میں آپ سے بیعت ہونا شروع ہوئے۔ مختلف ریاستوں کے اُمرا، و سرداران قبائل اور جلیل القدر علما و مشائخ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اور سمع و طاعت اور راہِ خدا میں جہاد پر آپ سے بیعت کی، اس کے بعد اُن حضرات نے حکومت پشاور کو اپنے اس اقدام کی اطلاع کی۔ حکام و اہلِ اقتدار نے ان کی تائید و توثیق کی اور خود بھی آپ سے بیعت ہونے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس کے بعد حضرت سید صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل صاحبؒ نے ہندوستان کے علما و سربرآوردہ اشخاص کے نام خطوط روانہ کیے اور ان کو اس اہم واقعہ کی اطلاع دی۔ ان تمام حضرات نے اس پر اپنی مسرت و اطمینان کا اظہار کیا اور سید صاحبؒ کی تائید کی۔ سردار یار محمد خاں، سلطان محمد خاں (اُمرائے پشاور) اور آخر میں ان کے بھائی سردار پیر محمد خاں نے بھی آپ سے بیعت کر لی۔ چنانچہ شیدو کے معرکہ میں آپ کے پرچم کے نیچے تقریباً ایک لاکھ مجاہد جمع تھے۔

حکومتِ لاہور کے ساتھ جنگ کا آغاز خالص اسلامی[1] طریقہ پر سنّتِ نبویؐ کے

---

[1] یعنی پہلے اسلام کی دعوت، پھر جزیہ کی مہلت اس کے بعد دعوتِ مبارزت، یہ وہ اسلامی

مطابق کیا گیا۔ سکھ اس وقت پنجاب پر قابض تھے۔ ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد میں اور آزاد قبائل پر بھی ان کا ایک گونہ تسلط قائم تھا۔ افغانستان کی سالمیت اور وجود بھی ان کی وجہ سے خطرہ میں تھا اور وہ کئی بار اس پر فوج کشی کر چکے تھے۔ پنجاب کے مسلمان جو عددی اکثریت میں تھے اور پانچویں صدی ہجری سے اب تک اس کے حکمران چلے آرہے تھے سخت تذلیل و اہانت کا نشانہ تھے اور اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ان کی مدد کی جائے۔ ان مظالم کا سدِ باب کیا جائے اور وہ خطرہ دُور ہو جو قریب کے اسلامی ملکوں کو اس کی وجہ سے لاحق ہو گیا تھا۔

اِس کے علاوہ پنجاب کی جنگی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت تھی۔ یہ جنگ رنجیت[2] سنگھ کے خلاف تھی جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر کا ممتاز ترین جنگی قائد و سپہ سالار اور اپنے عہد کا سب سے طاقتور فوجی حکمران تھا۔ تاہم مجاہدین اکثر معرکوں میں کامیاب رہے اور ان فوجوں پر غالب آئے جن کو پنجاب کا حکمران ان کی سرکوبی کے لیے بھیجتا تھا اور جن کا سربراہ کبھی کبھی ان دو تجربہ کار اطالوی کمانڈروں کو بنایا جاتا تھا جو یورپ کی جنگوں میں نپولین کی آزمودہ کار فوج کے جنرلوں میں تھے۔ یہ جنرل ونٹورہ (VANTURA) اور جنرل الارڈ (ALLARD) تھے۔

اس موقع پر مجاہدین کی صفوں میں شجاعت و جوانمردی، شوقِ شہادت، امیر کی اطاعت اور امن و جنگ، دونوں حالتوں میں احکامِ شریعت کی کامل پیروی کے ایسے نمونے نظر آئے، جن سے اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ ہو گئی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) طریقہ ہے جس کو اسلامی حکومتوں اور مسلم ممالک کے قائدین نے صدیوں سے فراموش و نظر انداز کر رکھا تھا۔

[2] (۱۷۸۰ء تا ۱۸۳۹ء) رنجیت سنگھ کی حکومت شمال میں کابل اور جنوباً و شرقاً جمنا کے کناروں تک وسیع تھی۔ تفصیل کیلیے دیکھیے کتاب (RANJECT SINGH, SIR LEPEL GRIFFIN)

انھوں نے ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحد میں جس میں پشاور اور اس کے نواح شامل تھے عملاً ایک صحیح اسلامی حکومت قائم کر لی۔ حدودِ شرعیہ کا باقاعدہ اجراء ہوا۔ مالیات، نظم و انتظام ہر شعبے میں احکامِ اسلامی کا حرف بحرف نفاذ کیا گیا۔ اس وقت تاریخ نے طویل مدت کے بعد ان مسلم حکومتوں کے درمیان (جن کو ہم احکامِ شریعت اور اسلامی قوانین سے بے اعتنائی کی وجہ سے سیکولر یا نامذہبی کہہ سکتے ہیں) خلافتِ راشدہ کا ایک زندہ اور عملی نمونہ دیکھا۔

لیکن افسوس کہ یہ مبارک تغیر و انقلاب زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کیا جا سکا اور یہاں بھی وہی ہوا جو تاریخ اسلام میں بارہا پیش آیا ہے۔ شخصی و قبائلی جذبات و مفادات نے سر اٹھایا اور زخم خوردہ و مشتعل جاہلیت نے اپنی شکست و ذلت کا بدلہ لینے کے لیے اس کمزوری کو پوری طرح استعمال کیا (جو مفاد پرستوں اور رسم و رواج کے پرستاروں میں ہمیشہ سے پائی جاتی ہے) اس علاقہ میں جو قبائل آباد تھے وہ ابھی تک اپنے ذاتی اغراض اور قبائلی رسم و رواج کے اثر سے پوری طرح آزاد نہ تھے۔ چنانچہ بعض امراء و سرداران قبائل سلطان محمد خاں والیٔ پشاور کی سربراہی میں اس کے خلاف بغاوت پر کمربستہ ہوگئے۔ یہ سلطان محمد خاں وہ شخص ہے جس کو سیّد صاحبؒ نے پشاور کا علاقہ (فتح کر لینے کے بعد) اس وعدے پر حوالے کیا تھا اور اس پر اس سے پورا عہد و پیمان لیا تھا کہ وہ یہاں حدودِ شرعیہ کا اجراء اور اعلاء کلمۃ اللہ کا فرض انجام دیگا (جو اس تگ و دَو اور جانفشانی کا اصل مقصد تھا اور جس کے لیے پشاور فتح کیا گیا تھا) لیکن اس کے آدمیوں نے شعبۂ احتساب و قضا کے ان اعمال و محصلین کو جو مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے[1] اس قدر سفاکی اور بے رحمی سے تہ تیغ کیا کہ اس کی مثال انقلابات اور بغاوتوں

---

[1] ان کی تعداد ڈیڑھ سو بتائی گئی ہے، جو سب کے سب منتخب ترین، صالح اور کارگذار افراد تھے اور اس معاشرہ کا عطر و جوہر۔

کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ بعد میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ دراصل ایک منظم سازش تھی جس میں تمام سردارانِ قبائل ملوث تھے اور وہ لوگ اس میں شریک تھے جن کو مہاجرین و مجاہدین کے ساتھ "انصار" کا کردار ادا کرنا چاہیے تھا۔ انھوں نے اس پورے نظام کو تہ و بالا کر دیا۔ اس وقت یہ مجاہدین اس پر مجبور ہوئے کہ کسی دوسری جگہ اپنا مرکز و مستقر بنائیں اور اپنے عظیم مقصد نظامِ اسلام کے قیام کے لیے از سرِ نو کوشش کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنا رُخ ہزارہ اور وادیٔ کشمیر کی طرف کر دیا۔ ان کو اس علاقہ کے اُمراء و سرداروں کی طرف سے یہاں آنے کی پیش کش کی گئی تھی اور ان کی حمایت کا پُورا وعدہ کیا گیا تھا۔

کشمیر کے راستہ ہی میں بالاکوٹ کا (جو وادیٔ کاغان میں دو بلند پہاڑیوں کے درمیان ایک بستی ہے) آخری معرکہ پیش آیا۔ بعض ضمیر فروش مسلمانوں نے غنیم کو اس کو مخبری اور تنگ و پیچیدہ راستوں پر مخالف فوج کی رہنمائی کر کے اس کو یہاں پہنچا دیا۔ خود رنجیت سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ اس فوج کی کمان کر رہا تھا۔ یہاں آخری معرکہ پیش آیا جس میں حضرت سیّد صاحبؒ مولانا شاہ اسمٰعیل صاحبؒ اور بہت سے دوسرے اکابر علماء اور مجاہد درجۂ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اس معرکہ میں سرفروشی و جانبازی و شجاعت و بسالت کے وہ محیّر العقول نمونے دیکھنے میں آئے جو چشمِ فلک نے عرصۂ دراز سے نہیں دیکھے تھے۔ یہ واقعۂ ہائلہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء میں پیش آیا۔

مجاہدین برطانوی حکومت کے مقابلے میں

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد حضرت سیّد صاحبؒ کے خلفاء اور رفقاءِ کار نے مولانا ولایت علیؒ عظیم آبادی اور ان کے بھائیوں اور بیٹوں کی قیادت و امارت میں آزاد قبائل کے درمیان علاقہ ستھانہ میں مجاہدین کا مضبوط مرکز قائم کیا۔ اور اب اس جہاد و قُربانی کا

رُخ سکھوں سے ہٹ کر جن کی سلطنت کا چراغ گل ہو چکا تھا[1]، انگریزوں کی طرف ہو گیا جو ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے اور یہاں ان کی ایک طاقتور اور منظم حکومت قائم ہو چکی تھی۔ رُخ کی یہ تبدیلی ان بلند و حقیقی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ تھی جو شروع سے سید صاحبؒ کے سامنے رہے، یہ مقاصد ان کے ان مکاتیب سے پوری طرح ظاہر و آشکارا ہیں، جو انھوں نے ہندوستان کے نوابین، راجگان اور وسط ایشیا کے مسلم سربراہانِ سلطنت کے نام لکھے تھے۔

جہاد و قربانی کی یہ نئی مہم ایسے حوادث و مصائب کی داستان ہے جس کو سُن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ یہ مسلسل جنگوں اور معرکہ آرائیوں کا سلسلہ تھا جو قتل و غارت گری، املاک و جائیداد کی ضبطی، طویل مقدمات، جلاوطنی، اخراج اور ایسی تحقیق و تفتیش پر مشتمل تھا جو قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی عدالتوں (INQUISATION) کے ساتھ مخصوص تھا۔ اگر جاں نثاری، ایثار و قربانی اور ہمت و جواں مردی کے وہ سارے کارنامے، جو اس ملک کے جہادِ حریت اور قومی آزادی کی تاریخ زینت اور اس کا سرمایۂ فخر ہیں ایک پلڑہ میں رکھے جائیں اور اہلِ صادق پور (خاندان مولانا ولایت علی عظیم آبادی) کے کارنامے اور قربانیاں ایک پلڑہ میں تو آخر الذکر کا پلڑہ نمایاں طور پر بھاری ہوگا۔[2]

---

[1] رنجیت سنگھ کی قائم کی ہوئی عظیم سلطنت پر انگریزوں نے ۱۸۴۹ء میں کلی طور پر قبضہ کر لیا جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کی شہادت کے کل ۱۸ برس بعد اس سلطنت کا چراغ بھی آخری طور پر گل ہو گیا۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" از مولانا مسعود عالم ندوی اور "سید احمد شہیدؒ" از غلام رسول مہر جلد چہارم "جماعتِ مجاہدین"

حیرت انگیز تربیت اور تنظیم

جہاد، تنظیم جماعت، مالی امداد اور مجاہدین کے مرکز ستھانہ تک رضاکاروں کو پہنچانے کے لیے ایک جال بچھا دیا گیا تھا اور اس مقصد کے لیے بہار اور بنگال میں کئی خفیہ مرکز تھے جو ایک خفیہ زبان میں مراسلت کرتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں وفادار رضاکار تھے جو امیر کے ایک اشارے پر چلنے کے لیے تیار تھے اور انگریزی حکومت دھمکی اور لالچ کے ذریعہ بھی ان کو اس سے باز رکھنے سے قاصر تھی[1]

اس تحریک نے بنگالیوں میں شجاعت و بہادری، اسلامی جوش، دینی حمیت، زندگی کی بے وقعتی، روح سپہ گری، راہِ خدا میں شہادت کا شوق، اسلامی اتحاد کا جذبہ اور اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت پر اپنی مصلحت کو قربان کر دینے کا حوصلہ اور اصولوں پر ثابت قدم رہنے کی عجیب و غریب طاقت پیدا کر دی تھی اور اس قوم کو (جس کی شہ سواری و سپہ گری اور جہاد و قتال کے میدان میں اس کے کارنامے دنیا نے عرصہ سے نہیں دیکھے تھے) ایک جنگجو اور بہادر قوم بنا دیا۔ مسٹر جیمس اوکینلی لکھتا ہے:

> "کمزور اور بزدل بنگالی مسلمان خونخواری اور جوشِ جہاد میں افغانیوں سے کم نہ تھے۔"

عقیدہ کی پختگی اور دینی دعوت و تربیت کے اثر سے شیطان ان کے اندر جاہلی حمیت اور لسانی تہذیبی یا نسلی و قومی تعصب پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا وہ صرف اسلام

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (THE GREAT WHABI CASE) اور ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب (OUR INDIAN MUSALMANS)

پر فخر کرتے تھے اور اس کی خدمت، اشاعت و تبلیغ، اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ عالیہ کو اصل معیار سمجھتے تھے۔

علمائے صادق پور نے مسلمانوں کی تنظیم، نظامِ شرعی کے قیام، مجاہدین کی تربیت، تصحیحِ عقائد اور اصلاحِ اعمال و اخلاق کا جو عجیب و غریب نظام قائم کیا تھا وہ اپنی وسعت و استحکام، مبلّغین کی سیرت و اخلاق اور جوش و ایثار میں اپنی نظیر آپ تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے داخلۂ ہند سے لے کر ۱۸۶۴ء تک اس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اِس جماعت و تحریک کا سب سے بڑا دشمن ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب "مسلمانانِ ہند" میں لکھتا ہے:

> "یہ لوگ مشنریوں کی طرح انتھک کام کرتے تھے، وہ بے لوث و بے نفس لوگ تھے جن کا طریقِ زندگی ہر شبہ سے بالاتر تھا اور روپیہ اور آدمی پہنچانے کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ ان کا کام محض تزکیۂ نفس اور اصلاحِ مذہب تھا۔"

> "میرے لیے ناممکن ہے کہ میں عزّت و عظمت کے بغیر اُن کا ذکر کروں، ان میں سے اکثر نہایت مقدس و مستعد نوجوانوں کی طرح زندگی شروع کرتے تھے ان میں سے بہت سے اخیر تک مذہب کے لیے اپنی جانفشانی اور جوش قائم رکھتے۔"

> "جہاں تک مجھے تجربہ ہے یہ یقینی ہے کہ "وہابی" مبلّغین سب سے بڑے رُوحانی اور کم سے کم خود غرض نوع کے لوگ ہیں۔"

> "یحییٰ علی[1] کی مردم شناسی اور حُسنِ انتخاب قابلِ داد ہے۔ ان کے

---

[1] مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی امیر جماعتِ مجاہدین

اِنتخاب کیے ہوئے آدمیوں میں ایک شخص کو پکڑے جانے کا خوف و خطرۂ شناخت ہو جانا، اِنعام کا لالچ اپنے رہنماؤں اور پیشواؤں کے خلاف آمادہ نہ کر سکا۔"

اِس تنظیم کی وسعت اور جماعت کی اعلیٰ سیرت کے متعلق بنگال کے اس وقت کے کمشنر پولیس کی شہادت کافی ہے کہ :

"اِس جماعت کے ایک ایک مبلّغ کے پیرو اَسّی اَسّی ہزار ہیں اِن میں آپس میں مکمّل مساوات ہے۔ ہر ایک دوسرے کے کام کو اپنا ذاتی کام سمجھتا ہے اور مصیبت کے وقت کسی بھائی کی مدد میں اس کو کسی بات سے عُذر نہیں ہوتا۔" [1]

یہاں تک کہ بالآخر ۱۸۵۷ء کی وہ جنگِ آزادی پیش آئی (جس کو برطانوی حکومت نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے نام سے مشہور کیا) اس کی قیادت اصلاً مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور اس میں جماعت مجاہدین کے بچے کھچے افراد کا قائدانہ حصّہ تھا۔[2] اور برادرانِ وطن بھی اس میں شریک تھے یہ کوشش بھی مختلف وجوہ اور اسباب کی بنا پر جس کی تفصیل موجبِ طوالت ہے، ناکام رہی اور اس کے قائدین بالخصوص مسلمان سخت مصائب کا شکار ہوئے۔ انگریزوں نے ان کے لیے ہر قسم کی درندگی اور بربریت روا رکھی۔ بالآخر انگریزوں کا اقتدار ملک پر

---

[1] "مسلمانانِ ہند" ڈاکٹر ہنٹر خطوط نمبر ۱ مورخہ ۱۳ مئی سنہ ۱۸۴۳ء و نمبر ۵۰ سنہ ۱۸۴۷ء

[2] اس جدوجہد کے قائدوں میں جنرل بخت خاں (سپہ سالارِ عام) اور مولانا لیاقت علی الہ آبادی کا تعلق سیّد صاحبؒ اور ان کی جماعت سے ثابت ہو چکا ہے۔ ہنٹر نے اعتراف کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں سیّد صاحبؒ کی تحریکِ جہاد کی بچی کھچی چنگاریاں کام کر رہی تھیں۔

پوری طرح قائم اور مستحکم ہوگیا۔[1]

برطانوی حکومت کی انتقامی کارروائی اور جماعت کی بے نظیر استقامت

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد بھی مجاہدین نے حکومتِ برطانیہ کے خلاف اپنی جدّ وجُہد نہ صرف جاری رکھی بلکہ تیز کردی، اس کا اندازہ سر ولیم ہنٹر کے ان بیانات سے ہوسکتا ہے کہ "ان مجاہدین کے خلاف حکومتِ برطانیہ کو بعض اوقات اپنی پوری فوجی طاقت سے کام لینا پڑا۔ بعض جنگی کارروائیوں میں بے قاعدہ مددگاروں اور پولیس کے علاوہ ساٹھ ہزار باقاعدہ سپاہی تھے۔ بعض دِنوں میں پنجاب کی چھاؤنیاں اس طرح فوجوں سے خالی ہوگئیں کہ حکومتِ پنجاب کو ہراول کا ایک دستہ وائسرائے کے کیمپ سے مستعار لینا پڑا۔ بعض مرتبہ انگریزی فوج کو پسپا ہونا پڑا اور حکومتِ پنجاب اس کو واپس بُلا لینے پر راضی ہوگئی۔ پنجاب کی حکومت کو افسوس رہا کہ یہ مہم ختم ہوگئی اور ہندوستان کے مذہبی مجنوں نہ تو نکالے جاسکے اور نہ ہم انھیں مطیع کرکے انھیں اپنے گھروں کو واپس کرسکے[2]

حکومت کو اپنی متعدد شکستوں، ہندوستان میں زیرباری اور انگلستان میں بدنامی سے سخت جھنجلاہٹ تھی۔ اس نے اپنا یہ غصّہ ہندوستان کے ان رؤسا، وشرفا، علما، وصُلحا، پر اُتارا جن کا کچھ بھی تعلق سرحد کے مرکز ستھانہ یا اس تحریک سے ثابت ہُوا، اور ان سے انتقام لینے کے جوش میں اس نے قانون بالائے طاق رکھ دیا۔ ۱۸۶۴ء میں اس نے مولانا یحییٰ علی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" باب "ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا حصّہ" از صفحہ ۱۵۴ تا صفحہ ۱۷۶

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، "ہندوستانی مسلمان" از ڈاکٹر ہنٹر

صاحب عظیم آبادی، ان کے بھائی مولانا احمد اللہ صاحب، رئیس پٹنہ عظیم آباد، ان کے ایک عزیز مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری، مولوی محمد جعفر تھانیسری، رئیس تھانیسر، محمد شفیع[1] سوداگر و رئیس لاہور اور ان کے بعض کارندوں پر سازش کا مقدمہ چلایا۔

ان میں سے مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی، مولوی عبدالرحیم صاحب صادق پوری اور مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری اور ان کے بعض رفیقوں کو انبالہ جیل میں رکھا۔ یہ قیدی سرور و مستی کی ایسی حالت میں تھے کہ انگریز تماشائی اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ خاص طور پر مولانا یحییٰ علی صاحب سراپا جذب و شوق نظر آتے تھے، وہ مشہور صحابی حضرت خبیبؓ کی رُباعی لطف لے لے کر پڑھتے جس میں انھوں نے پھانسی کے تختہ پر چڑھتے وقت کہا تھا، کہ "جب میں اسلام کی حالت میں مارا جاؤں تو مجھے اس کی ذرا پروا نہیں کہ میری موت کس کروٹ پر ہو"۔ ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو انگریز سیشن جج نے ایک مجمع عظیم کے سامنے سزائے موت کا حکم سُنایا اور فرطِ غضب میں آخر میں یہ الفاظ کہے کہ "میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہُوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا"۔ مولانا یحییٰ علی صاحب اس فیصلہ کو سُن کر ایسے خوش ہوئے گویا اُن کو دلی مُراد مل گئی۔ مولوی محمد جعفر صاحب اپنی کتاب "کالا پانی" میں لکھتے ہیں کہ "مجھ کو اپنی اُس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں اس حکمِ پھانسی کو سُن کر ایسا خوش ہُوا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے سے بھی اس قدر مسرور نہ ہوتا"۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے جو ایمان کی قوّت اور شہادت کی فضیلت کے علم سے بے بہرہ تھے۔ ایسی ناقابلِ فہم تھی کہ انگریز کپتان پولیس پارسن سے (جس نے ان مظلوموں پر خاص طور پر ظلم ڈھائے تھے) نہ رہا گیا اور اس نے مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری سے پوچھا کہ "تم کو پھانسی کا حکم ملا ہے تم کو رونا چاہیے تم کس

---

[1] لاہور میں سرائے شفیع کے نام سے اب بھی انار کلی کے قریب ایک محلہ موجود ہے۔

واسطے اتنا بشاش ہے"۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے جواب دیا کہ "شہادت کی اُمید پر جو سب سے بڑی نعمت ہے اور تم اس سے نا آشنا ہو"۔

یہ حضرات انبالہ جیل کے پھانسی گھر میں رکھ دیئے گئے۔ یہاں بکثرت انگریز مرد و عورت تماشا دیکھنے اور ان کی ذلت و مصیبت سے اپنا دل خوش کرنے آتے ایک جمگھٹا لگا رہتا لیکن دُوسرے عام پھانسی پانے والوں کے برخلاف ان کو شاداں و فرحاں پا کر یہ یورپین زائرین تصویرِ حیرت بن جاتے۔ سبب دریافت کرنے پر ان کو بھی وہی جواب ملتا جو انکے ہم قوم پارسن کو دیا گیا تھا۔ جب یہ چرچا انگریزوں میں پھیلا اور ان کو معلوم ہُوا کہ یہ دیوانے پھانسی پانے کو اللہ کی نعمت سمجھ رہے ہیں اور بقولِ اقبال ؎

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
شہادت نہیں موت ان کی نظر میں

تو جُرم و سزا کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ اس سزا کو اس لیے منسوخ کیا گیا کہ اس سے سزا یاب کو خوشی حاصل ہوگی اور وہ اپنے کو فائز المرام سمجھے گا۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۶۴ء کو ڈپٹی کمشنر انبالہ پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سُنایا کہ "تم لوگ پھانسی پانے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو، اس واسطے سرکار تمھاری دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی۔ تمھاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدلی گئی"[1]

۱۸۶۵ء میں یہ لوگ پورٹ بلیر انڈمان بھیجے گئے اور ان کے مکانات کھُدوا کر پھکوا دیئے گئے۔ قبرستان میں ہل چلا دیا گیا۔ جائدادیں ضبط کی گئیں۔ مولانا یحییٰ علی صاحب اور مولانا احمد اللہ صاحب وہیں بحالت جلاوطنی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری

---

[1] ملاحظہ ہو "کالا پانی" از مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری۔

اور مولانا عبدالرحیم صاحب صادقپوری ۱۸ برس اس کالے پانی میں جلاوطن رہ کر رہا ہوئے اور ہندوستان واپس ہوئے۔[1]

۱۹۴۷ء تک یہی صورتحال قائم رہی۔ اس کے بعد آزادی کا دور آیا اور یہ تحتی برّاعظم دو حصّوں پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم ہوگیا۔ پاکستان کے حصّہ میں جو ملک آیا اس میں وہ سب علاقے تھے جن کو اس اصلاح و جہاد کی تحریک میں اولیت دی گئی تھی اور وہ شروع سے ان کے پیشِ نظر تھے —— اگرچہ آج اس اوّلین خاکہ اور اس موجودہ تصویر میں بڑا فرق ہے۔ سیّد صاحب کے پیشِ نظر جو عظیم اور اعلیٰ مقاصد تھے اور جس کے لیے انھوں نے زندگی بھر دعوت دی اور بالآخر اس پر اپنی جان قربان کر دی، وہ اس کردار سے بہت مختلف ہے جس کا نظارہ اس ملک کے سیاسی، انتظامی اور اخلاقی اسٹیج پر دُنیا نے دیکھا ہے۔

اِمکانی تدبیر اور مناسب حکمتِ عملی

سیّد صاحبؒ نے اس وقت جو سپاہی اور جنگی منصوبہ بندی کی، اس سے زیادہ بہتر منصوبہ بندی کا کم از کم اس دَور میں اس پیچیدہ اور نازک صورتِ حال میں تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس منصوبہ سازی میں ان کی سلامتِ طبع، دُوراندیشی اور بصیرت کا اندازہ صرف اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو اس کے تاریخی پس منظر اور ان تجربات سے آگاہ ہو جن کی وجہ سے ان اقدامات پر وہ مجبور ہوئے نیز اس نے سیاسی، سماجی، عسکری صورتِ حال کا پوری گہرائی اور تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہو جو انیسویں صدی کے اوائل میں ہمیں ہندوستان میں نظر آتی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "کالا پانی" یا "تواریخِ عجیب" از مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری۔ مطبوعہ صوفی پرنٹنگ پریس پنڈی بہاؤالدین پنجاب اور الدرالمنثور فی تراجم اہلِ صادقپور۔

ہے۔ اس سے پہلے انگریزی اقتدار سے نجات اور ایک مستحکم مرکز اور اقتدار کے قیام کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں جو مختلف قائدین اور والیانِ ریاست نے کی تھیں، حالانکہ اس فہرست میں سلطان ٹیپو شہید (سنہ ۱۲۱۴ھ - ۱۷۹۹ء) جیسا عالی حوصلہ غیّور اور جانباز قائد، امیر خاں (سنہ ۱۲۵۰ھ) جیسا شہسوار اور شجاع جرنل بھی شامل ہے۔ ان دونوں سے قبل نواب سراج الدولہ والئ مرشد آباد (م سنہ ۱۱۷۰ھ) اور نواب شجاع الدولہ حاکم اودھ (سنہ ۱۱۷۷ھ) اپنے عظیم وسائل اور منظم افواج کے باوجود اس کوشش میں ناکام رہے تھے۔ اس کا پہلا سبب انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی کامیاب پالیسی تھی۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان میں کوئی ایسا آزاد علاقہ نہ تھا جہاں انگریزوں کی دسترس سے محفوظ ہو کر جہاد کی عملی سرگرمیاں اور تیاریاں پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ جاری رکھی جاسکتیں۔

اِس قسم کے سیاسی اور فوجی منصوبے اور نقشے ہمیشہ بہتر اور ترجیحی صورت، مخلصانہ غور و فکر اور خیر خواہ اور مخلص اہل الرائے سے تبادلۂ خیال و اتّفاقِ آراء کے بعد تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ (اگر یہ قائد و رہنما رضائے الٰہی کے لیے اور خدا کا نام بلند رکھنے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہو) تو دُعاء اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز و درماندگی اور فقر و بے چارگی کا کامل اظہار، اِستخارہ اور اعتماد علی اللہ کا عنصر بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہم جب سیّد صاحبؒ کی مساعی و جدّ و جُہد کا تاریخی جائزہ لیتے ہیں تو اس میں کوئی شبہ نظر نہیں آتا کہ انھوں نے یہ تمام شرائط پورے کئے تھے اور اس میں کسی کوتاہی اور غفلت سے کام نہیں لیا تھا۔

اپنے عصری مقامی پیمانوں سے کسی ایسی شخصیت یا تحریک کو ناپنے کی کوشش جس پر طویل عرصہ گزر چکا ہو اور جس کا اصل مرکز اور میدان بھی دُور اور مختلف ہو اور کسی ایسی مخلصانہ اور سنجیدہ کوشش پر (محض ان نتائج کی بُنیاد پر جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت سے ہے) کوئی فیصلہ صادر کرنا ایک غیر منصفانہ اور غیر حقیقت پسندانہ کوشش ہے۔ اگر کامیابی

وناکامی کا یہی پیمانہ یا "بیرومیٹر" ہم اپنے سامنے رکھیں گے تو ہمیں اسلامی تاریخ میں سعیِ پیہم، دعوت و عزیمت اور جہاد و قربانی کے بہت سے حسین اور روشن ابواب سے محروم ہونا پڑے گا، اس لیے کہ اسلام میں معاملہ کا سارا انحصار حُسنِ نیّت، انتہائی انسانی کوشش، صدق و اخلاص اور اپنی امکانی حد تک مفید اور کامیاب طریقۂ کار کے انتخاب پر ہے نہ کہ محض نتائج، ظاہری کامیابیوں اور مادی فوائد پر:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ
صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ
عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى
نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ
وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔
(الاحزاب)

مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ
جو اقرار انھوں نے خدا سے کیا تھا اس کو
سچ کر دکھایا تو ان میں بعض ایسے ہیں جو
اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے
ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں اور انھوں
نے اپنے قول کو ذرا بھی نہیں بدلا۔

مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے اس تحریک اور جدوجہد پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب سیّد احمد شہید میں کتنا صحیح لکھا ہے:

> "تاریخِ ہند و پاک میں جس عہد کو مسلمانوں کا دورِ زوال کہا جاتا ہے یہ اسی کا ایک باب ہے، لیکن کیا کوئی حق پسند اور حق شناس انسان اس اعتراف میں تامل کرے گا کہ مسلمانوں کے عہدِ عروج و اقبال کا بھی کوئی حصہ اصولاً اس سے زیادہ شاندار یا زیادہ قابلِ فخر نہیں ہو سکتا۔ حکم و فیصلہ کا انحصار نتائج پر نہیں بلکہ عزمِ جہاد، ہمتِ عمل اور راہِ حق میں کمالِ استقامت پر ہوتا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کمالِ عزیمت اور کمالِ ہمت و استقامت کی ایسی مثالیں ہمارے عہدِ عروج کی داستانوں میں مل سکتی ہیں، جن میں

مقصود، نصب العین، دین اور صرف دین رہا ہو"؟ [1]

تجدید و احیا کے چند عظیم کارنامے اور انقلابی اصلاحات

سیّد صاحبؒ کے عظیم کارناموں میں سے ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے اہم رکن کو انھوں نے زندہ کیا جو ایک طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے متروک اور ناقابلِ عمل سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کے نقوش و آثار صرف قرآن و حدیث، سیرت اور ان مجاہدینِ اوّلین کی تاریخ میں باقی رہ گئے جو صرف اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے اور دینِ حق کو غالب کرنے کے لیے جہاد کرتے تھے، کوئی دنیاوی غرض ملک و مال، حکومت و سلطنت یا خاندان و اولاد کے لیے کوئی انتظام اور بند و بست ان کے پیشِ نظر ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ سلاطینِ اسلام نے یا اس فریضہ کو اپنے ذاتی اغراض اور ہوس و ملک گیری کے لیے غلط طور پر استعمال کیا تھا یا سرے سے اس کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اصحابِ دعوت و اصلاح بھی اپنی مشغولیت یا اس پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے اس سے قاصر رہے۔ دوسری طرف مسلمان جہاد کی اہمیت و فضیلت کو تقریباً فراموش کر چکے تھے اور فقہ کے بعض مسئلوں[2] سے بھی کم ان کی اہمیت رہ گئی تھی اور اس کا شمار "مستحبات" میں کیا جانے لگا تھا۔

اسلام کے اس رکنِ عظیم کے ساتھ اس بے اعتنائی نے عالمِ اسلام کو بہت شدید

---

[1] سیّد احمد شہید ص ١٦ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

[2] مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے جو سیّد صاحبؒ کے دستِ راست اور گویا ترجمان اور وزیر تھے علما و مشائخ کے نام ایک مکتوب میں یہ الفاظ لکھے ہیں: "جہاد کی اہمیت آج علما کے نزدیک اتنی بھی باقی نہیں رہ گئی ہے جتنی ان کی نگاہ میں کتاب الحیض والنفاس کی اہمیت ہے"۔

نقصان پہنچایا، ناخدا ترس و بے ضمیر اور کمتر درجہ کے لوگ قدرتاً جری و بے باک ہو گئے، اسلام اور مسلمانوں کی شوکت مجروح ہوئی اور وہ مسلمان جنھوں نے طویل صدیوں تک اس ملک پر حکمرانی کی اور اس کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیا، اپنے ہی ملک میں غریب الدیار اور تذلیل و اہانت کا شکار ہو گئے۔ ان کی مسجدیں بے تکلّف گرائی جاتیں، ان کی حرمت و ناموس سے کھیلا جاتا اور ان کی عزّت خاک میں ملائی جاتی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی یہ پیشگوئی ان کے بالکل حسبِ حال تھی۔

إذا ترکتم الجهاد	اگر تم جہاد کرنا ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ
سلّط الله علیکم ذلاًّ،	تم پر ذلّت مسلّط کرے گا اور اس کو اس
لا ینزعه حتی ترجعوا	وقت تک دُور نہ کرے گا جب تک تم
إلیٰ دینکم [1]	اپنے دین پر واپس نہ آجاؤ گے۔

پورا عالمِ اسلام بالخصوص اس کے وہ حصّے جو خلافتِ عثمانیہ کے مرکز سے زیادہ دُور رہے، اس ذلّت آمیز اور شرمناک صورتِ حال سے دوچار تھے۔

جہاد کی ضرورت و اہمیت پر خود سیّد صاحبؒ نے جو ارشادات "صراطِ مستقیم" میں فرمائے ہیں ان کا مطالعہ اس سلسلہ میں کافی ہوگا۔ اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :

> " آسمانی برکتوں کے نزول کے سلسلہ میں (جو فریضۂ جہاد کے قیام سے وابستہ ہیں) روم و ترکی سے ہندوستان کا مقابلہ کرکے دیکھ لو، سالِ رواں ۱۲۳۳ھ میں ہندوستان جس کا بڑا حصّہ (انگریزی اقتدار میں) دارالحرب بن چکا ہے اس کا مقابلہ دو سو تین سو برس پہلے کے ہندوستان سے کرو۔

---

[1] ابو داؤد بروایت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ

آسمانی برکتوں کا کیا حال تھا اور اولیائے عظام اور علمائے کرام کی کتنی بڑی تعداد پائی جاتی تھی“۔ [1]

لیکن اسلام کے اس رکنِ عظیم کو زندہ کرنے کے لیے سیّد صاحبؒ کے اس ”جہاد“ نے جہاد کو زندہ اور اپنی اصل حقیقت وصورت کے ساتھ باقی رکھا اور مسلم معاشرہ نیز مسلمانوں کے افکار وخیالات احساسات وجذبات، اسلامی ادب اور اُردو شاعری [2] پر اس کے ناقابلِ انمٹ اثرات مرتّب ہوئے، مَوت کا ڈر دِلوں سے نکل گیا، راہِ خُدا میں تکلیفیں برداشت کرنا بلکہ جان قربان کرنا آسان معلوم ہونے لگا، شہادت کا ایسا شوق دامن گیر ہُوا جیسے کوئی پرندہ سرِشام اپنے نشیمن میں پہنچنے کے لیے بےچَین وبےقرار ہوتا ہے —— ناز پروردہ نوجوان اور اُمراء و اغنیا ہجرت وجہاد کی سختیاں جھیلنے اور بے آرامی، زُہد وقناعت اور ایثار و قربانی کی زندگی گزارنے پر آمادہ ہوگئے۔ یہ جذبہ اتنا عام ہُوا کہ بیبیاں اپنے بچوں کو لوری دیتیں تو ایسے اشعار پڑھتیں:

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

---

[1] ”صراطِ مستقیم“ باب دوم فصل چہارم افادۂ پنجم

[2] اس کا ثبوت جہاد کی فضیلت میں مومن خاں مومن کا کلام اور مولانا خرم علی بلہوری کے ”قصیدۂ جہادیہ“ سے مِلتا ہے جو مجاہدین کی اگلی صفوں میں عین لڑائی کے آغاز کے وقت پڑھا جاتا تھا۔ سیّد صاحبؒ ہی کے خاندان کے ایک فرد منشی سید عبد الرزاق کلامی مرحوم نے ”فتوح الشام“ موسوم بصمصام الاسلام (مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ) کے نام سے غزوات اسلام پر ایک شاہ نامہ تیار کیا تھا، جو پچیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب پورے ملک میں پھیل گئی تھی اور علم و دین کے گھرانوں اور عام مسلمانوں میں باقاعدہ پڑھی جاتی تھی اور سب بیٹھ کر اس کو سنتے تھے۔ یہ سب اسی دعوت وجہاد کا نتیجہ تھا جس کا پرچم سیّد صاحبؒ نے بلند کیا اور اس کے نتیجہ میں یہ فضا قائم ہوئی۔

جہاد و شہادت کا یہ نشہ لوگوں پر ایسا طاری ہُوا کہ بعض اوقات چاہنے والا باپ اپنے جوان بیٹے کو معرکۂ کارزار میں شہید ہونے کے لیے پیش کرتا جیسا کہ نواب فرزند علی رئیس غازیپور نے اپنے بیٹے امجد کو یہ کہہ کر پیش کیا "میں چاہتا ہُوں کہ ذبیح اللہ اسمٰعیلؑ کی طرح اس کے بھی گلے پر اللہ کی راہ میں چُھری چلے"۔ نوجوانوں میں قرعہ اندازی ہوتی اور والدین اپنے اس لڑکے کو ملامت کرتے جو پیچھے رہ جاتا۔ ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے کہ :

> "کوئی وہابی[1] باپ اپنے کسی غیر معمولی دیندار بیٹے کے متعلق نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ (جہاد کے لیے) اس کے گھر سے کب غائب ہو جائے گا"

اُن کا دُوسرا بڑا کارنامہ اسلام کے نظامِ امارت اور منصبِ امامت کا احیاء ہے یہ بھی اسلام کا وہ رکن ہے جس کو مسلمان طویل عرصہ سے چھوڑ بیٹھے تھے اور اس کی وجہ سے ان کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا اور ان کی حیثیت بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ کی طرح ہو گئی تھی، جس کا کوئی گلہ بان اور محافظ و پاسبان نہ ہو حالانکہ اسلام نے اس نوع کی زندگی کو جاہلیت سے تعبیر کیا ہے اور اس حال پر زندہ رہنے اور مرنے سے خبردار کیا ہے اور اس کو سخت ناپسندیدہ بات قرار دیا ہے کہ مسلمان پر ایک گھڑی بھی اس حال میں گزرے کہ ان کا کوئی امیر یا امام نہ ہو اس عظیم سُنّت اور رکنِ اسلام کے احیاء کا شرف بھی اس جماعت کے حصّہ میں آیا اور سب سے پہلے اسی نے اس متروک سنّت کو اس وقت از سرِ نو زندہ کیا جب عالمِ اسلام کے اکثر حصّوں میں تاریخ کے ایک طویل دَور تک اس پر کوئی عمل پیرا نظر نہ آرہا تھا۔

اگر اسلام کے ان دو عظیم الشان ارکان کے زندہ و تابندہ کرنے کے علاوہ سیّد صاحبؒ کا اور کوئی کارنامہ نہ ہوتا اور انھوں نے مسلمانوں کی نگاہ میں ان کا اعتبار و وقار بحال کرنے

---

[1] انگریزی حکومت اور انگریز مصنف سید صاحبؒ کی جماعت کے لوگوں کو اسی طرح یاد کرتے ہیں۔

اوران کو محبوب و مرغوب بنا دینے کے سوا اور کوئی خدمت انجام نہ دی ہوتی تو یہ ان کے فخر و عظمت کے لیے کافی تھا، لیکن اس کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی ناقابلِ فراموش اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں فریضۂ حج کا احیاء جو متروک ہوتا جا رہا تھا اور بحری سفر کے خطرات اور راہ کی بدامنی کو بُنیاد بنا کر علمی و فقہی طور پر اس کو ساقط کرنے کی کوشش جاری[1] تھی۔ اس موقع پر سید صاحبؒ کی وہ تقریر پڑھنی کافی ہے جو انھوں نے شوال ۱۲۳۶ھ میں سفرِ حج شروع کرتے وقت ضلع رائے بریلی دلمئو میں فرمائی تھی:

> "جنابِ الٰہی میں میں نے اہلِ ہند کے لیے بہت دُعا کی کہ الٰہی ہندوستان سے تیرے کعبہ کی راہ مسدود ہے۔ ہزاروں مالدار صاحبِ زکوٰۃ مر گئے، اور نفس و شیطان کے بہکانے سے کہ راستہ میں امن نہیں ہے حج سے محروم اور ہزاروں صاحبِ ثروت اب جیتے ہیں اور اسی وسوسہ سے نہیں جاتے ہیں۔ سو اپنی رحمت سے ایسا راستہ کھول دے کہ جو ارادہ کرے بے دغدغہ چلا جائے اور اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ رہے۔ میری یہ دُعا اس ذاتِ پاک نے مستجاب کی اور ارشاد ہوا کہ حج سے آنے کے بعد یہ راستہ علی العموم کھول دیں گے سو انشاء اللہ جو مسلمان بھائی زندہ رہیں گے وہ یہ حال بچشمِ خود دیکھیں گے۔"[2]

اسی طرح نکاحِ بیوگاں جو اس زمانہ میں سخت معیوب سمجھا جاتا تھا، اور اگر کوئی اسکی جرأت کرتا تھا تو اس کا مقاطعہ کیا جاتا یا اس کو خاندان سے الگ کر دیا جاتا تھا۔ شرفاء اور عالی

---

[1] دیکھیے سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اوّل عنوان "حج کی عدم فرضیت کا فتنہ" ص۲۴۷ نیز "فریضۂ حج کی ہندوستانی تجدید ص۲۵۱

[2] "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصہ اوّل ص۲۶۲ بحوالہ وقائع احمدی ص۶۰۲

نسب خاندانوں سے اس کا رواج جاتا رہا تھا یہ بات در اصل حکومتِ مغلیہ کے زوال کے زمانہ میں ہندوؤں کے اثر سے جن کے ہاں بیوہ کا نکاح قطعی طور پر ممنوع تھا پیدا ہو گئی تھی، یہاں تک کہ بعض علماء نے اس جاہلی فعل کی حمایت میں رسائل تک لکھے[1]۔ سیّد صاحبؒ کی کوشش سے یہ بات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور نکاحِ بیوگان کا رواج پڑ گیا اور اس مظلوم طبقہ نے جو مسلمانوں کے ہزاروں گھروں میں زندہ در گور ہو رہا تھا، شریعت و سُنّت کے سایہ میں نئی زندگی پائی۔ اس وقت کے ایک عالم شاعر حسن نے اپنے قصیدہ میں جو بطورِ تہنیت سیّد صاحبؒ کے سفرِ حج سے واپسی پر کہا تھا اپنے مندرجہ ذیل اشعار میں اس انقلابِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ذات سے تیری یتیموں کو بہت تقویت   زنِ بیوہ کے تو حق میں ہے سحابِ ممطر
تھا غضب ظلم کہ بیوہ نہ کرے عقدِ نکاح   کھوئی یہ رسمِ زبوں رحمتِ حق ہو تجھ پر
جس میں راضی ہو خدا ہے وہی انکو منظور   آبرو کا نہ انھیں خوف نہ کچھ جی کا ڈر

اس طرح ان لڑکیوں کی شادی کا بھی آپ کی کوشش سے آغاز ہُوا جو افغانی قبائل میں مختلف رسوم و قیود کے نتیجے میں عرصہ تک بیٹھی رہتی تھیں اور شادی کی نوبت نہ آتی تھی اور اس کے نتیجے میں ان کے اندر مختلف اخلاقی و طبی امراض اور شرعی منکرات راہ پاتے تھے، اور سخت غیر فطری زندگی گذارنی پڑتی تھی —— اس کے علاوہ انھوں نے جاہلیت کے اثرات و نشانات، رفض، ہندوانہ تہذیب اور رسم و رواج اور بدعت کی مختلف شکلوں کی (جو غیر اسلامی عناصر سے اختلاط اور کتاب و سنّت سے بعد کے نتیجے میں مسلم معاشرہ میں اندر تک سرایت کر چکی تھیں) بیخ کنی کی —— مزید برآں اسلام کا نظامِ مالیات، نظامِ دیوانی و فوجداری

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، عنوان "بیوہ کا نکاح" ص ۲۲۹ سیرت سید احمد شہیدؒ

اور شعبۂ احتساب و قضا قائم ہُوا[1]، حدودِ شرعیہ نافذ کی گئیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوت الی اللہ کا اجرا عمل میں آیا اور خلافتِ اسلامیہ کے دوسرے مہمات اور شالی اسلامی معاشرہ کے اصل نقوش و خصوصیات دُنیا کے سامنے آئے۔

ایک بڑا انقلاب وہ عمومی دینی فضا تھی جو اس دعوت و تحریک کے اثر، امامِ جماعت اور اس کے باخدا و صاحب علم و تاثیر رفقاء کے دوروں اور وعظ و ارشاد سے سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھی اور زندگیوں کا رُخ غفلت و بے دینی سے دینداری اور خدا پرستی کی طرف پھر گیا تھا اور ایک نئی دینی اصلاحی و تعلیمی تحریک پورے مُلک میں پیدا ہوگئی تھی۔ مذکورالصدر شاعر حسن اس انقلابِ حال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

جس طرف دیکھئے تعمیرِ مساجد ہے گی   ہے ہر اک شخص کی تحقیق و مسائل پہ نظر
آتی ہر سمت سے ہے بانگ مؤذن کی صدا   جس کو سُنیے یہی کہتا ہے کہ اللہ اکبر
اِس قدر عصر میں تیرے ہوئی افراطِ نماز   لاکھوں تیار ہوئے ملک میں چھوٹے منبر
قطع بدعات ہوئی فیض سے تیرے ایسی   ہند سے رسم بری اُٹھ گئیں صدہا یکسر
دیکھیے جس کو سو کرتا ہے کلام اللہ یاد   باندھی ہر شخص نے تہذیب ہدایت پہ کمر
تیری تائید سے اک خلق ہوئی تائب   تیری تنبیہ سے لاکھوں ہوئے فاسق اطہر
اک قدم دھرنے کی جگہ بھی نہیں واں ملتی   جو کہ چھوٹی ڈھی مسجد تھی پڑی صاف کھنڈر[2]

سفرِ حج کو جاتے ہوئے کلکتہ کے زمانۂ قیام میں جب دینداری کی ایک ہوا سی چل گئی یک لخت شراب بکنی موقوف ہوگئی، یہاں تک کہ دکانداروں نے سرکارِ انگریزی میں عذر خواہی کی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے "جب ایمان کی بہار آئی"۔ عنوان "نظامِ قضا و احتساب کا قیام" ص۱۴۰

[2] پورا قصیدہ سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول، اور سید احمد شہیدؒ از غلام رسول مہر میں دیکھا جا سکتا ہے

کہ سرکاری محصول معاف کیا جائے، جب سے ایک بزرگ اپنے قافلہ کے ساتھ اس شہر میں آئے ہیں، شہر اور دیہات کے تمام مسلمان اُن کے مرید ہوئے اور ہر روز ہوتے جاتے ہیں، انھوں نے تمام نشہ آور چیزوں سے توبہ کرلی ہے اب کوئی ہماری دکانوں کو ہو کر نہیں نکلتا، نکاحِ شرعی کی ترویج ہوئی، بے پردگی کا اِنسداد ہُوا، شرک و بدعت کے نشانات مٹنے لگے اور ان کی جگہ سنّت و شریعت کے نشانات نے لی، بنگال و آسام میں تبلیغِ اسلام و اصلاح کی ایک رَو چلی اور بکثرت لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ اس موقع پر صاحبِ مخزن کا یہ شعر بالکل حسبِ حال تھا

زدیں خلق و عالم پُر آوازہ گشت
تو گفتی کہ عہدِ نبی تازہ گشت

واقعہ یہ ہے کہ یہ شعر صرف کلکتہ ہی پر صادق نہیں آتا، اس عہد کے پورے ہندوستان پر صادق آتا ہے۔

ہمہ گیر اور دُور رس اثرات

اِس تحریک و دعوت کے اثرات بڑے ہمہ گیر اور دُور رس تھے، اس نے اصلاحِ حال، کتاب و سنّت کی طرف رجُوع، اتّباعِ شریعت و اعلائے کلمۃ اللہ کا جو صور پھونکا تھا، اس کے اثر سے ملک کے مختلف گوشوں میں نئی نئی اصلاحی تحریکیں اور دینی کوششیں شروع ہوئیں جنھوں نے اپنی اپنی جگہ مفید کام انجام دیا اور مسلمانوں میں نئی نئی بیداری پیدا ہُوئی، مشرقی بنگال میں نثار علی (عرف ٹیٹو میاں) کی اِصلاحی تحریک برِّ صغیر کی جماعت اہلِ حدیث، صادقپور پٹنہ کا مرکزِ جہاد و تربیت، امرتسر کا غزنوی خاندان اور اس کی تعلیمی تبلیغی کوششیں، دارالعلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارنپور اور اُنکے طرز کے صدہا عربی مدارس جو اس برِّ صغیر ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں، سلفی المسلک مدارس و جامعات اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کا علمی و دینی مرکز سب نے کم و بیش اسی ایک چراغ سے روشنی حاصل کی جو تیل بتّی کے بجائے

خونِ جگر اور اشکِ سحر گاہی سے جلایا گیا تھا اور جس کو ایک "مردِ درویش" نے جس کو خدا نے "اندازِ خسروانہ" بخشے تھے، تیز آندھی میں بھی فروزاں رکھا تھا ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

مغربی مصنّفین کا معاندانہ اور غیر ذمّہ دارانہ رویّہ

اِس عظمت و شہرت کے باوجود جو سیّد صاحبؒ کو اپنے زمانہ میں اور اس کے بعد حاصل ہوئی اور ان کے ان اصلاحی و انقلابی کارناموں کی موجودگی میں جو پچھلی صدیوں سے کم کِسی مصلح اور داعی کی تاریخ میں مِلتے ہیں، جزم و وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یورپ میں (پیغمبرِ اسلام محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات مستثنیٰ کر کے) کِسی شخصیت اور دعوت پر لکھنے میں اتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا گیا جتنا سیّد احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک کے بارے میں دیا گیا ہے [1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں نے اس سلسلہ میں پڑھنے اور محنت کرنے کی بالکل

---

[1] شاید اس موقع پر باخبر ناظرین کو یہ خیال گزرے کہ بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر کے مشہور عرب مصلح اور داعیٔ توحید شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی (ولادت سـ۱۱۱۵ھ م سـ۱۲۰۶ھ) کا معاملہ اس بارے میں سید صاحبؒ سے کچھ مختلف نہیں بلکہ بڑھا ہوا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شیخ کے متعلق جو کچھ لکھا اور کہا گیا ہے وہ عربی ترکی اور مشرقی زبانوں میں ہے اور زیادہ تر مسلمانوں کے قلم سے ہے، مغرب کے فضلاء نے ان کے خلاف کوئی خاص مہم نہیں چلائی، جہاں تک مغرب کے اہلِ قلم کا تعلق ہے انھوں نے سید صاحبؒ کے بارے میں جو معاندانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرز اختیار کیا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

ضرورت نہیں سمجھی یا انھوں نے سُنی سنائی باتوں پر اعتماد کیا، یا تاریخ نویسی سے زیادہ تاریخ سازی سے کام لیا۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد حرّیت فکر، حقیقت و صداقت کی تلاش اور علم و تحقیق کا جو دُور شروع ہُوا تھا اور مذہبی تعصبات، اوہام پرستی اور بلاتحقیق کسی بات کو مان لینے اور اس کو رٹتے رہنے کے خلاف جو خونریز جنگ لڑی گئی تھی اور جس نے نہ صرف یورپ کو بلکہ ساری دُنیا کو فائدہ پہنچایا۔ اس سے توقع تھی کہ کسی علمی و تاریخی موضوع پر قلم اُٹھانے اور تحقیق کرنے میں اصل محرک مذہبی عناد یا سیاسی اغراض نہیں ہوں گی بلکہ حقیقت کی مخلصانہ تلاش اور طالب علمانہ جُستجو ہوگی اور کم سے کم انیسویں صدی کے نصف اول کے اہل قلم اور مصنّفین اس سے زیادہ وسیع النظری، وسیع القلبی اور بے لاگ تحقیق کا ثبوت دیں گے جتنا قرونِ وسطیٰ کے ان مصنّفین اور فضلاء نے دیا جنھوں نے جنگِ صلیبی کے سایہ میں پرورش پائی تھی اور جو حقائق سے زیادہ جذبات سے مغلوب تھے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ انسانی زندگی تضاد کا ایک عجیب وغریب مرقع ہے اور دُنیا میں وہ بہت کچھ دیکھنا اور ماننا پڑتا ہے جس کے پیش آنے کی کوئی توقع اور جواز نہیں ہوتا۔

معروف زندگی، محفوظ تاریخ

سیّد احمد شہیدؒ الف لیلیٰ کی کوئی افسانوی شخصیت یا ماقبل تاریخ کا کوئی انسانی کردار نہ تھے، انھوں نے تیرھویں صدی کے اوائل اور اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں نشوونما پائی۔ ان کی تعلیم و تربیت اور ابتدائی سرگرمیوں کا مرکز شمالی ہند کا وہ آباد اور مرکزی خطّہ تھا جو علم و ادب، تہذیب و تمدّن اور سیاسی اہمیت کے اعتبار سے ہندوستان کا درجہ اول کا علاقہ تھا، اور جس کو قدیم انگریزی اصطلاح میں صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کہتے تھے پھر ان کا

رابطہ دہلی اور دہلی کے شہرۂ آفاق خاندان ولی اللّٰہی سے قائم ہُوا جس کے علم و درس کا سکّہ سارے ہندوستان میں چل رہا تھا، خود ان کا خاندان اَودھ کا مشہور و معروف سادات کا خاندان تھا جو کم سے کم پانچسو برس سے نامور علماء و مشائخ کی بدولت جو اس خاندان میں پیدا ہوتے رہے اور اپنی خاندانی روایات زاہدانہ زندگی اور وقار و سنجیدگی کی وجہ سے قرب و جوار میں عزّت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ہر دَور میں دہلی کے مغل فرمانروا اس سے اپنی عقیدت کا اظہار اور اس کی عالی نسبی کا اعتراف کرتے رہے اور ان سب فارسی تذکروں میں جو مختلف عہدوں میں لکھے گئے اس خاندان کے ممتاز افراد کا ذکر ملتا ہے پھر وہ جنگی تربیت و مہارت حاصل کرنے کے لیے وقتی طور پر سنبھل (یوپی) کے ایک بلند حوصلہ افغانی سردار نواب امیر خاں کی فوج میں رضا کارانہ خدمات انجام دیتے رہے (جو بعد میں راجپوتانہ کی اسلامی ریاست ٹونک کے بانی ہوئے) نواب ممدوح ان کو بڑی عزّت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان سے عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ نواب امیر خاں کی زندگی اور حالات بھی تاریکی میں نہیں ہیں اور ان پر متعدّد کتابیں لکھی جا چکی ہیں ان کو پنڈاروں اور اٹھارویں صدی کے وسط کے ٹھگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا (جیسا کہ انگریز مؤرخین کو غلط فہمی ہوئی ہے یا انھوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے)

امیر خاں کے لشکر سے واپسی کے بعد ان کی طرف علماء و مشائخ، شرفاء و اُمراء کا ایسا رجوع ہُوا اور انھوں نے پروانوں کی طرح ان سے بیعت ہونے اور ان سے روحانی فائدہ اٹھانے کے لیے ایسا ہجوم کیا جس کی مثال ہندوستان میں بہت دُور تک نہیں ملتی، پھر انھوں نے صوبجاتِ متحدہ کے کئی دعوتی و تبلیغی دورے کیے جس میں یہ پُورا علاقہ ان پر امنڈ آیا اور توبہ و اصلاح اور ردّ شرک و بدعت کی ایسی تیز رَو چلی جس کی مثال عرصہ دراز سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی، پھر انھوں نے ساڑھے سات سو آدمیوں کے ساتھ (جو اس زمانہ

کے وسائل کے لحاظ سے بہت بڑی تعداد تھی) اس شان و شوکت سے حج کیا جس کی کوئی نظیر نہ ہندوستان کے بادشاہوں کی تاریخ میں ملتی ہے نہ علماء و مشائخ کے سوانح و تذکروں میں۔ اپنے وطن رائے بریلی سے لے کر جہاں سے انھوں نے یہ سفر شروع کیا تھا، کلکتہ تک جو ان کے خشکی کے سفر کا منتہیٰ تھا، گنگا کے کنارے کا یہ پورا علاقہ ایک نئی زندگی سے آشنا اور ایک نئے جوش سے مخمور ہوگیا، اور پورے کے پورے شہر ان کے حلقۂ ارادت اور دائرہ اصلاح میں داخل ہوگئے۔[1]

پھر وہ مکہ اور مدینہ گئے، جہاں ان کا ایسا استقبال ہوا جو عرصہ سے کسی غیر عرب دینی شخصیت کا نہیں ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حجاز میں وہابیت یا وہابیوں کا نام لینا بھی خطرے کو دعوت دینے اور اپنے کو مشکوک بنانے کے مرادف تھا، وہاں ان کے کسی وہابی مبلّغ سے ملنے کی کوئی ادنیٰ سی شہادت نہیں ملتی، ان کا دینی و ذہنی ارتقاء اس سفر سے پہلے اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا اور ان کی اِصلاحِ عقیدہ اور اصلاحِ عمل کی دعوت جو قرآن و حدیث کے براہِ راست مطالعہ پر مبنی تھی، ہندوستان ہی میں واضح اور معیّن ہو چکی تھی[2]

پھر انھوں نے جہاد اور خلافتِ اسلامیہ کے احیاء کے لیے جس کے حدود ان کے وسیع منصوبے اور بلند تخیّل میں ہندوستان سے لے کر ترکستان، بلکہ ترکی تک وسیع تھے، ایک زبردست تحریک شروع کی اور آزاد قبائل کے علاقہ کو اپنی اس دعوت و جدّ و جہد کا مرکز بنایا، اپنے مستقر سے ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر پہنچنے کے لیے آپ نے ایک عظیم

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "سیرت سیّد احمد شہیدؒ" حصہ اول ص۲۵۶، ص۳۸۱ ۔

[2] ملاحظہ ہو سیّد صاحبؒ کی مختلف تقریروں اور مواعظ کی قلمی روئدادیں اور ان کی تعلیم و تحقیقات کا مجموعہ "صراطِ مستقیم" جو ۱۲۳۳ھ (ء) حج کے سفر سے تین سال قبل مکمل و متداول ہو چکا تھا۔

قافلہ کے ساتھ ہندوستان، بلوچستان اور افغانستان کا جو طویل اور پُر مشقّت سفر کیا، اسکی روئداد اتنی منضبط، مفصّل اور صحیح معلومات پر مشتمل ہے اور اس میں ایک ایک مقام اور ان کے فاصلے، ان کی جغرافیائی و تمدّنی حالت کا اتنا مستند بیان موجود ہے جس کی کسی سرکاری دَورے کی روئداد یا روزنامچے سے توقع کی جاسکتی ہے[1]۔ وہاں سے انھوں نے ہندوستان سے رابطہ قائم رکھا، وہ اپنے عزائم اور اقدامات کی اطّلاع گشتی مراسلوں کے ذریعہ ہندوستان کے علماء اور بااثر لوگوں کو دیتے رہے، ان دعوتی و سرکاری خطوط کے مجموعے، ہندوستان کے مختلف خاندانوں اور کتب خانوں اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ میدان جنگ میں بھی ان کے حالات اور جنگی کارروائیوں کی روئداد لکھی جاتی رہی۔

ان کی شہادت کے بعد جو ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں پیش آئی، ان کے حالات اور ان کی زندگی کے جزئیات لکھنے کا اتنا اہتمام کیا گیا جو شاید ہی کسی مصلح اور قائد کے بارے میں مختلف صدیوں میں کیا گیا ہو، اس سلسلہ میں دو کوششوں کا ذکر کرنا نامناسب نہیں ہوگا۔

ایک وہ کوشش جو اجتماعی اور منظم طریقہ پر والیِ ریاست ٹونک نواب وزیرالدولہ کے حکم و تعاون سے شہادت کے عین بعد ٹونک میں کی گئی جہاں ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو برسوں ان کے ساتھ رہے تھے، جنگی موقعوں پر شریک تھے اور ان کے شب و روز سے واقف تھے، انھوں نے اجتماعی طریقہ پر اپنے چشم دید واقعات اور ذاتی معلومات قلمبند کرائے، یہ گویا علمی انداز کا پہلا منظّم (اکیڈمک) کام تھا جو انجام پایا، یہ قلمی دفتر چار

---

[1] ملاحظہ ہو منشی سیّد حمیدالدین صاحب کے فارسی خطوط جو انھوں نے سفر کے دوران ہندوستان کے اعزاء اور معززین کو لکھے اور جو مجموعۂ خطوط قلمی میں محفوظ ہیں۔

ضخیم جلدوں[1] میں ہے، جس کا نام "وقائع احمدی" ہے۔

دوسرا مستند ترین ذخیرہ مولوی سیّد جعفر علی نقوی (م ۱۲۸۸ھ) کی فارسی تصنیف "منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء" ہے، کتاب کے مصنّف قدیم ضلع گورکھپور حال ضلع بستی کے ایک نامور سادات وعلماء کے خاندان کے فرد اور جیّد عالم اور فارسی کے انشا پرداز تھے، وہ خود محاذِ جنگ پر تھے اور لشکر کے میر منشی کی خدمت اُن کے سپرد تھی جو ان کی گہری واقفیت اور مستند معلومات کی ضامن ہے۔

تیسری تاریخی دستاویز سیّد صاحبؒ کے بڑے بھانجے مولوی سیّد محمد علی (م ۱۲۶۶ھ) کی فارسی زبان میں تصنیف "مخزنِ احمدی" ہے جو سیّد صاحبؒ کی ولادت سے لے کر حج سے واپسی تک کے حالات میں سب سے بڑا قابلِ اعتماد مآخذ ہے، اِس لیے کہ وہ ان کے عزیز قریب کے قلم سے ہے، مصنّف اکثر واقعات کے چشم دید گواہ اور سفر وحضر کے رفیق تھے۔ نواب محمد علی خان والئ ٹونک کے عہد میں یہ کتاب لکھی گئی اور آگرہ کے مطبع میں یہ کتاب چھپ کر شائع ہوئی۔

چوتھا مآخذ مولوی محمد جعفر تھانیسری اسیر پورٹ بلیئر و متہم مقدمۂ سازش ۱۸۶۴ء کی تصنیف "سوانح احمدی" ہے، جس نے سیّد صاحبؒ کے حالات کی اشاعت کی بڑی خدمت انجام دی۔ یہ اُردو میں پہلی کتاب تھی جو سیّد صاحبؒ کے حالات میں چھپ کر ہندوستان میں عام ہوئی اور گھر گھر پہنچی، مصنّف سیّد صاحبؒ کے خلفاء سے بیعت اور سیّد صاحب کے سچے اور پُرجوش معتقد تھے، وہ ۱۸ برس تک کالا پانی رہ کر وطن واپس ہوئے تھے، انگریز اس جماعت کی ہر چیز کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اِس لیے یہ کتاب خاص

---

[1] یہ جلدیں کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ ہیں۔

احتیاط سے لکھی گئی اور اس میں ان حقیقتوں کا اظہار نہ کیا جا سکا جس کا آزادی کے دور میں برملا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ اس موضوع پر سب سے جامع اور مکمل تصنیف مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی "سید احمد شہیدؒ" ہے، یہ چار ضخیم جلدوں میں ہے، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۹۲۱ ایک ہزار نو سو اکیس ہے۔ اس کو سید صاحبؒ کی سیرت اور آپ کی تحریک جہاد و دعوت اور جماعت مجاہدین اور آپ کے ممتاز رفقائے کار کے حالات میں ایک انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیئے۔ یہ کتاب لاہور سے طبع ہوئی ہے اور علمی و ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔

راقم سطور نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے نام سے لکھی ہے، ۱۹۳۹ء میں یہ کتاب ایک جلد میں چار سو باسٹھ ۴۶۲ صفحہ میں شائع ہوئی۔ اس پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ایک بلیغ اور دل آویز مقدمہ تھا جس کا شمار سید صاحبؒ کی بہترین شگفتہ ادبی تحریروں میں ہے۔ اس مقدمہ سے نوعمر مصنف کی جس کی عمر اس وقت ۲۴ سال سے زیادہ نہ تھی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ یہ مصنف کی پہلی کوشش اور اس کے قلم کا پہلا ثمر تھا۔

کتاب کا ہندوستان کے علمی و دینی حلقوں میں جس طرح غیر معمولی طور پر استقبال ہوا، اس سے اس پیاس کا اندازہ ہوتا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں میں موجود تھی۔ ہندوستان کے مخصوص سیاسی حالات اور اسلام کے اقتدار و غلبہ کے شوق و آرزو نے ان کے اندر ایسی چیزوں کی طلب پیدا کر دی جو ان کے اندر خود اعتمادی و خود شناسی اور ایمان و یقین کے کے سوئے ہوئے جذبات بیدار کر سکیں، چنانچہ پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گیا اور اس کے بعد کئی ایڈیشن شائع ہوئے، اسی دوران مصنف نے اس میں اضافہ اور تحسین و تنقیح کا کام جاری رکھا اور ان اضافات کی وجہ سے کتاب کا حجم پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا۔ کتاب کا پانچواں ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں پاکستان سے اور چھٹا ۱۹۷۸ء میں ہندوستان سے دو ضخیم

جلدوں میں شائع ہُوا، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ایک ہزار ایک سو پینتالیس ۱۱۴۵ ہے، اور اس میں جا بجا اہم تاریخی نقشے، تاریخی مقامات کی تصویریں اہم دستاویزات شامل ہیں۔

آخر میں سیّد صاحبؒ پر انگریزی میں ایک نئی کتاب (SAIYID AHMAD SHAHID, HIS LIFE AND MISSION.) کے نام سے شائع ہُوئی جو گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہے اور جدید اسلوب میں لکھی گئی ہے، اور بہت سی تاریخی دستاویزات سرکاری رپورٹوں اور غیر ملکی شہادتوں اور بیانات پر مشتمل ہے، اِس کتاب کے مصنّف محی الدین احمد ہیں۔ یہ کتاب بڑے سائز کے اور باریک انگریزی حروف کے ۴۲۷ صفحات میں آئی ہے، ان کتابوں کے علاوہ متعدد اور کتابیں، رسائل اور مقالات ہند و پاک نیز یورپ اور امریکہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

افسوس ہے کہ عربی زبان میں اس موضوع پر بہت کم چیزیں ملتی ہیں اور عالمِ عربی اِس اہم شخصیت اور اس کے نامور افراد کے کارناموں سے بالعموم ناواقف ہے اور شاید اس سلسلہ میں سب سے پہلی کوشش راقم سطور کا وہ رسالہ ہے جس کو علّامہ سیّد رشید رضا مرحوم نے اپنے مشہور رسالہ "المنار" (۱۳۴۹ھ ۔ ۱۳۵۰ھ) ۱۹۳۱ء میں شائع کیا اور پھر بعد میں اس کو ایک علیحدہ اور مستقل رسالے کی شکل میں چھپوایا۔ اس رسالہ کا عنوان تھا "السید الامام احمد بن عرفان الشہید، مجدد القرن الثالث عشر" اِس رسالہ کی تحریر کے وقت مصنّف کی عمر ۱۷ سال سے زیادہ نہ تھی، اِس لیے اس میں ان کتابوں کا معیار نظر نہ آئے گا، جو فکری پختگی مکمّل مطالعہ اور وسیع تجربے کے بعد لکھی جاتی ہیں تاہم آگے چل کر مصنّف کو عربی میں ایک نئی متوسّط درجہ کی کتاب لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ جس میں اس تحریکِ جہاد و قربانی کے ان مختلف اثر انگیز واقعات کو سلیس عربی زبان میں جمع کیا ہے، جن سے سیّد صاحبؒ کی نگاہ کی دُور رسی ان کی صحبت کی کیمیا اثری اور ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والوں کی اسلامی سیرت و

کردار اور اُن کے بلند اخلاق کا اندازہ ہوتا ہے، اسی کے ساتھ دعوت وجہاد کی مختصر حلہ وار تاریخ بھی بیان کی گئی ہے تاکہ اس کا پُورا پس منظر سامنے آجائے۔ یہ کتاب "اذا ھبت ریح الایمان" کے نام سے شائع ہوئی اور لکھنؤ و بیروت سے اِس کے تین اڈیشن نکلے[1]

ایک ایسی معروف شخصیت جس کی پیدائش سے لے کر شہادت تک کے حالات اِس قدر تیز روشنی میں ہوں کہ صرف وہی شخص ان سے ناواقف ہوسکتا ہے جو اپنی آنکھیں پورے طور پر بند کرلے اور دیکھنے کا اِرادہ ہی نہ کرے، اور ایک ایسی تحریک کے متعلّق جسکی جزئیات اِس تفصیل کے ساتھ قلمبند کی گئی ہوں جو جدید عصری طریقوں سے کسی طرح کم نہ ہوں، قیاس آرائیاں، قِصّے کہانیوں پر انحصار اور بے سند لکھی ہوئی یا کہی ہوئی باتوں کو دہراتے رہنا عصرِ جدید کا ایک ایسا تضاد اور علمی دُنیا کی ایک ایسی بوالعجبی ہے، جس کی کوئی تاویل آسانی سے ممکن نہیں۔

عناد و تعصّب کے چند نمونے

یہاں پر اس کی صرف چند مثالیں ہی پیش کی جاسکتی ہیں جن سے اِس غیر ذمّہ دارانہ اور غیر علمی طرزِ عمل کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے، جس کو ہمارے بہت سے مغربی مصنّفین نے (جو تاریخی موضوعات پر بال کی کھال نکالنے کے عادی ہیں) اپنے لیے روا رکھا ہے۔

ہیوگس (HUGHES) ڈکشنری آف اسلام "مقالہ وہابی" میں لکھتا ہے:

" اور پھر جب ایک بے چین طبیعت شخص ہندوستان سے اپنے

---

[1] اردو میں یہ کتاب "جب ایمان کی بہار آئی" کے عنوان سے مولوی فضل ربی ندوی ناظم مجلسِ نشریاتِ اسلام ناظم آباد کراچی نے شائع کی ہے۔

پچھلے گناہوں کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے مکّہ حج کرنے گیا تو وہاں وہ اُن وہابی مبلّغین کے زیرِ اثر آگیا جو حاجیوں میں خفیہ طور پر وہابیت کی اشاعت کر رہے تھے۔"

" رائے بریلی کا قزاق اور ڈاکو سیّد احمد مراسمِ حج ادا کرنے کے بعد مکّہ سے ۱۸۲۲ء میں اس عزم کے ساتھ واپس آیا کہ پورے شمالی ہندوستان کو پرچمِ اسلام کے زیرِ نگیں لے آئے گا۔"

اولف کیرو (OLAF CAROE) اپنی کتاب (THE PATHAN) ص ۳۰۱ میں لکھتا ہے:

" سیّد احمد بریلوی بدنامِ زمانہ امیر خان کا پیرو تھا، جس نے وسط ہند میں پنڈاروں کے خلاف انگریزوں کی مہم کے زمانہ میں کرایہ کے سپاہیوں کا ایک جتھّا جمع کر لیا تھا۔ امیر خاں کی فوج منتشر ہونے کے بعد سیّد احمد کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔"

پی ہارڈی (P- HARDY)(THE MUSLIM OF BIRTISH INDIA) ص ۵۱ پر لکھتا ہے:

" سیّد احمد ایک غیر معروف خاندان میں پیدا ہوئے جو شاید معمولی درجہ کے ملازمت پیشہ لوگ تھے۔ ۱۸۰۹ء سے ۱۸۱۸ء تک وہ پنڈاری سردار امیر خان کی فوج میں جو بعد میں ٹونک کے نواب ہوئے، ایک سپاہی رہے، اس عرصہ میں شاید کوئی ایسی بات نہیں تھی جو انھیں دوسرے پنڈاری قزاقوں سے ممتاز کرتی۔"

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر "ہندوستانی مسلمان" ص ۶۰-۶۱ میں لکھتا ہے۔ "وہابی ہونے کے الزام

میں سیّد احمد کو علانیہ ذلیل کر کے مکّہ سے نکال دیا گیا۔"

ص۲۴ میں لکھا ہے:

> " اِس طرح اپنی گزشتہ سوانح حیات کو جو بحیثیت ایک قزاق کے گزری تھی، حاجی کے لباس میں چھپا کر اگلے سال ماہ اکتوبر [illegible] میں وارد ہوئے۔"

یہ اس "علمی تحقیق" اور "ترقی یافتہ" تاریخ نویسی کے چند نادر نمونے ہیں جو اس غیر ذمہ دارانہ طرزِ تحریر کو ظاہر کرتے ہیں جس کی بیسویں صدی کے ان یورپین مؤرخین سے بالکل توقع نہ تھی، جن کو سفر، مستند معلومات اور جرح و تعدیل کے مقرّرہ اصولوں سے فائدہ اُٹھانے کا پورا موقعہ حاصل تھا۔

مغربی مصنّفین کے مشرقی خوشہ چیں

مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا کے بھی بیشتر فضلاء نے جن کو وہابیت، مہدویت اور ہندوستان کی تحریکِ جہاد پر قلم اٹھانے کی ضرورت پیش آئی، انھیں مصنّفین پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرنے اور مکّھی پر مکّھی مارنے سے زیادہ لیاقت کا ثبوت نہیں دیا۔ سب سے زیادہ تعجب اور شکایت ان عرب فضلاء اور مصنّفین سے ہے جو ہندوستان کے علمی و تاریخی ذخیرہ سے بلا واسطہ یا بالواسطہ صحیح معلومات اخذ کر سکتے تھے۔ جن کے ہندوستان کے صحیح الخیال علماء اور مرکزوں اور اداروں سے روابط تھے، جن کو یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ سیاسی و جماعتی اغراض کی بناء پر جزیرۃ العرب کے بارہویں صدی کے عظیم مصلح شیخ محمّد بن عبد الوہاب کے خلاف الزامات و افترأت کا کیسا جال بُنا گیا ہے جس نے ان کی شخصیت اور کارناموں پر دبیز پردہ ڈال دیا۔ اور جن کو اس صورتِ حال کے خلاف شکایت و احتجاج کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے یہاں

بطورِ نمونہ ایک ایسے عالم کی کتاب کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس کو عام اشاعت و تقسیم کے لیے حکومتِ سعودیہ نے شائع کیا اور اس پر وہاں کے ایک جلیل القدر عالم کا مقدّمہ بھی ہے۔ علاّمہ احمد بن حجر بن محمّد (قاضی محکمۂ شرعیہ قطر) اپنی کتاب "الشیخ محمد بن عبد الوہابؒ" کے صفحہ ۷۸، پر لکھتے ہیں:

> "اس طرح سے شیخ محمد بن عبد الوہاب کی دعوت نے ہندوستان کے بعض علاقوں کو متاثر کیا۔ یہ کام ایک ہندوستانی حاجی سیّد احمد کے ذریعہ عمل میں آیا۔ یہ شخص ہندوستان کے والیانِ ریاست میں سے تھا جس نے ۱۸۱۶ء میں اسلام قبول کرنے کے بعد[1] فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حجاز کا سفر کیا جب ان کی وہاں مکہ میں وہابیوں سے ملاقات ہوئی تو وہ اس بات کے قائل ہوئے کہ ان کی دعوت بہت صحیح اصولوں پر قائم ہے اور وہ ان کے مذہب کے ایسے پُرجوش و مخلص داعی بن گئے جن کے دل و دماغ پر عقیدہ حاوی ہو جاتا ہے۔"[2]

یہ درحقیقت مغربی مصنّفین کی خوشہ چینی اور مکمل طریقہ پر انھیں کی بیانات پر اعتماد اور تحقیقِ حق کی براہِ راست کوشش نہ کرنے کا افسوسناک نتیجہ ہے جس کا شکار ڈاکٹر احمد امین[3]

---

[1] سیّد لکھنے کے بعد مصنّف کو یہ خیال پیدا نہ ہوا کہ وہ پشتینی مسلمان تھے۔ اس کے بعد ان کے اسلام قبول کرنے کا کیا مطلب تھا؟

[2] "الشیخ محمد بن عبد الوہابؒ" مطبعۃ الحکومۃ مکہ مکرمہ ص۷۸ (۱۳۹۵ھ) سیّد صاحبؒ کے تذکرے اور ان کی سرگرمیوں کے لیے جن میں اسی انداز سے واقعات بیان کیے گئے ہیں ص۸۹ بھی ملاحظہ ہو۔

[3] ملاحظہ ہو کتاب المہدویۃ والمہدیون۔

جیسے فاضل مصنّف (جن کے قلم سے فجر الاسلام، ضحی الاسلام، ظہر الاسلام جیسا مشہور و مقبول سلسلہ نکلا ہے) اور بعض دوسرے عرب مصنّفین ہوئے۔ جنھوں نے تمامتر انگریزی فرانسیسی مآخذ پر انحصار رکھا۔

مثال کے طور پر ہم ڈاکٹر احمد امین کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، وہ اپنی کتاب "زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث" میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

> "ہندوستان میں ایک وہابی رہنما و قائد پیدا ہوا جس کا نام سیّد احمد تھا۔ اس نے ۱۸۲۲ء میں فریضۂ حج ادا کیا وہاں اس نے پنجاب میں اس دعوت کا علم بلند کیا اور وہاں تقریباً وہابی اقتدار قائم کرلیا۔ اسکی قوت و طاقت بڑھتی رہی یہاں تک کہ شمالی ہندوستان کو بھی اس سے خطرہ لاحق ہونے لگا۔ اس نے بدعات و خرافات کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا اور اس علاقہ کے واعظین و اہلِ دین سے جنگ کی اور ہر اس شخص کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جو ان کے مذہب پر عمل پیرا اور ان کی دعوت کا حامل نہ ہو، اس نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ انگریزی حکومت کو اس کی اور اس کے پیروکاروں کی وجہ سے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر وہ ان کے دبانے میں کامیاب ہوئی" [1]

شاید ان تاریخی غلطیوں (اگر ہم ان کو مغالطوں کا نام نہ دیں) کی تعداد اس مختصر اقتباس میں اس کی سطروں سے کم نہ ہوگی، اور یہ وہ باتیں ہیں جن میں کسی بحث و تمحیص کا سوال نہیں۔ ہر وہ شخص، جس کو سیّد صاحبؒ کی سیرت، ان کی تحریکِ جہاد و دعوت، نیز

---

[1] زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث ص ۲۱

اس عہد کی عمومی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت ہے وہ بداہتہً ان کو جانتا اور سمجھتا ہے —— ان غلطیوں کی وجہ یہی تھی کہ یہ معلومات انگریزی مآخذ سے ماخوذ تھیں جس میں کلّی طور پر انھیں پر انحصار کیا گیا تھا اور اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی کہ ان کی سیرت و کارناموں کا، اور تاریخ دعوت و جہاد کا اچھی طرح اور مکمّل مطالعہ کیا جائے یا ان لوگوں سے یہ معلومات حاصل کی جائیں جو ہندوستان کی شخصیتوں سے واقف ہیں اور جن کا گاہ بگاہ مصر جانا ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ہندوستان کے مصلحین کی صفِ اوّل میں سر سیّد احمد خاں اور سیّد امیر علی کے بجائے وہ ان کو جگہ دیتے۔ میں نے ۱۹۵۱ء میں اپنے سفرِ مصر کے دوران ان کی توجہ ان غلطیوں کی طرف مبذول کرائی۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ سیّد صاحبؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کس مرتبہ کے لوگ تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے تذکرہ میں انھوں نے سیّد صاحبؒ کی کتنی غلط تصویر پیش کی ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ ان دونوں کے بارے میں ان کی معلومات ناکافی تھیں اور ان کو فکرِ اسلامی کی تاریخ میں ان کی اہمیت اور مسلم معاشرہ میں ان کے ہمہ گیر اثرات کا اس قدر اندازہ نہ تھا۔[1]

ہمارے عرب و مسلم مصنّفین و اہلِ قلم کی یہ وہ تحریریں ہیں جن کو پڑھ کر ایک عرب شاعر کا یہ شعر یاد آرہا ہے ؎

وظلم ذوی القربیٰ أشد مضاضةً   علی النفس من وقع الحسام المهند

بعض اکابر معاصرین کی شہادتیں

کسی شخص کی عظمت اور اصل حیثیت و مرتبہ کا اندازہ اس کے صاحبِ نظر معاصرین

---

[1] دیکھیے کتاب "شرقِ اوسط کی ڈائری" از مصنّف

کی شہادتوں سے ہو سکتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم صرف دو تین اقتباسات پر اکتفا کرینگے۔

ہندوستان کے شہرۂ آفاق مصنّف و مؤرّخ نواب سیّد صدیق حسن خاں (والیٔ بھوپال) (م ۱۳۰۷ھ) جنھوں نے ان کی تعلیم و تربیت کے اثرات کو خود دیکھا تھا، اور ان کے دیکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت کو انھوں نے دیکھا تھا "تقصاد جیود الأحرار" میں لکھتے ہیں :

> "خلقِ خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجُوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے، ایک بڑی خلقت اور ایک دُنیا آپ کی قلبی و جسمانی توجّہ سے درجۂ ولایت کو پہنچی۔ آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمینِ ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا اور کتاب و سنّت کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ ابھی تک ان کے وعظ و پند کے برکات جاری و ساری ہیں"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :

> "خلاصہ یہ کہ اس زمانہ میں دُنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحبِ کمال سُنا نہیں گیا اور جو فیوض اس گروہِ حق سے خلقِ خدا کو پہنچے، ان کا عشرِ عشیر بھی اس زمانہ کے علماء و مشائخ سے نہیں پہنچا"۔

علامۂ عصر اُستاذ الاساتذہ حضرت مولانا حیدر علی رامپوری ٹونکی تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (م ۱۲۷۳ھ) "صیانۃ الناس" میں تحریر فرماتے ہیں :

> "ان کی ہدایت کا نُور آفتاب کی مثل کمال زور اور شور کے ساتھ بلاد اور قلوبِ عباد میں منوّر ہُوا۔ ہر ایک طرف سے سعیدانِ ازلی رختِ سفر باندھ کر منزلوں سے آ آکے، شرک و بدعات وغیرہ منہیات سے کہ حسبِ عادتِ زمانہ خوگر ہو رہے تھے توبہ کر کے توحید و سنّت کی راہِ راست اختیا

کرنے لگے اور اکثر ملکوں میں خلفار راست کردار جناب موصوف نے سیر فرما کر لاکھوں آدمی کو دینِ محمّدی کی راہِ راست بتا دی، جن کو سمجھ تھی اور توفیقِ الٰہی نے ان کی دست گیری کی وہ اس راہ پر چلے۔"

اور ہزاروں خلیفہ جا بجا مقرّر ہوئے کہ ان سے ایک سلسلۂ بیعت و ارشاد و تلقین جاری ہے اور وہ لوگ جو نماز روزے سے بیزار اور بھنگ بوزے سے کاروبار رکھتے تھے، شراب اور تاڑی ان کے بدن کا خمیر ہو رہا تھا، برملا کہتے تھے کہ نماز کمپنی کا حکم نہیں اور نہ روزہ کونسل کا آئین۔ زکوٰۃ و حج کا پھر کیا ذکر ہے؛ شب و روز رشوت و زنا و مردم آزاری اور سُود خوری میں مشغول رہتے تھے اور مرد و عورت مثل حیوانات بے نکاح باہم ہوتے اور سینکڑوں ولد الزنا ان سے پیدا ہوتے اور صدہا پیر و جوان نامختون نصاریٰ اور مشرکوں کے مثل تھے، محض حضرت کی تعلیم سے اپنے گناہوں سے توبہ کر کے نکاح اور ختنے کروائے۔ نیک پاک اور متقی ہو گئے۔ حضرت کے ہاتھ پر دس دس ہزار آدمی ایک ایک بار بیعت کرتے گئے اور بہت بہت ہنود اور رافضی اور جوگی اور انت حضرت کے ارشاد و تلقین سے خالص مُسلمان ہو گئے اور بعضے نصاریٰ بھی اپنی قوم سے آکر خُفیہ ایمان لے آئے پھر ہزارہا عُلماء نے بعد حصول بیعت و خلافت رہنمائی خلق اللہ اختیار کی۔ بعضوں نے وعظ و نصیحت و ارشاد و تلقین کو عادت سی ٹھہرائی اور بعضوں نے آیاتِ قرآنی و احادیثِ صحیحہ کی کتابیں لکھیں اور رسالے اور ترجمے شائع کیے کہ جس میں ترغیبِ عبادات اور ترہیبِ گناہ ہی سے اپنے ملک کی زبان میں پیشہ اپنا کر کے ہزاروں جُہلاء کو کہ سیدھا کلمہ بھی پڑھنا نہیں جانتے تھے، عالم بنا دیا اور

بعضوں نے دونوں طریقے اختیار کیے"۔[1]

ہندوستان کے ایک باخبر اور ثقہ عالمِ دین جنھوں نے اس جماعتِ قدسیہ کے بہت سے افراد کی زیارت کی تھی اور جن کا زمانہ قریب تھا، مولوی عبدالاحد صاحب لکھتے ہیں:

> "حضرت سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ ہنود وغیرہ کفّار مسلمان ہوئے، اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء کے ذریعہ تمام رُوئے زمین پر جاری ہے۔ اِس سلسلہ میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں"۔[2]

مشہور عالمِ ربّانی اور مجاہد فی سبیل اللہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی (م ۱۲۶۹ھ) تحریر فرماتے ہیں:

> "جس وقت دعوت کی آواز ملک ہندوستان میں بلند ہوئی، تمام ملک کے لوگ پروانوں کی طرح اس شمعِ ہدایت پر ہجوم کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک روز میں دس دس ہزار آدمیوں کی جماعت بیعت ہونے لگی، ان کا گروہ روز بروز بڑھتا گیا، اور ہزارہا انسان اپنا دین چھوڑ کر اسلام سے مشرف ہوئے اور ہزارہا لوگوں نے مذاہبِ باطلہ سے توبہ کی، پانچ چھ برس کے عرصہ میں ہندوستان کے تیس لاکھ آدمیوں نے حضرت سے بیعت کی اور سفرِ حج میں تقریباً لاکھ آدمی بیعت سے مشرف ہوئے، ان سب لوگوں میں ہزارہا عالم ہیں اور ہزارہا عاقل اور سینکڑوں حافظ ہیں اور سینکڑوں مفتی

---

[1] صیانۃ الناس عن وسوسۃ الخناس از مولانا حیدر علی رامپوری مطبوعہ ۱۲۷۰ھ ص ۴، ۵ تا ص ۶۔

[2] سوانح احمدی

اور بہتیرے جہاندیدہ ہیں اور بہتیرے کار آزمودہ، اِس سے صاف ظاہر ہُوا کہ اللہ کے حضور میں اُن کی بڑی مقبولیت اور تائید ہے کہ تمامی خلائق کا دل ان کی طرف بے اختیار کھنچا جاتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر مرید ہوتے ہیں"[1]

پھر اس دعوت کے اثرات اور اس کے اثر سے زندگی کے تغیرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اِس متبرک گروہ کا اثر دریافت کیا چاہیئے کہ جو شخص اعتقاد کے ساتھ اِس گروہ میں داخل ہُوا اور اس نے بیعت کی۔ اسی وقت سے اس کو دُنیا سے نفرت اور آخرت کا خوف پیدا ہوتا ہے اور روز بروز یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے اور شرک و بدعت سے محض پاک ہو جاتا ہے اور اللہ کی محبّت و عظمت شرع کی تعظیم و توقیر، نماز کا شوق سب اس کے دِل میں جگہ پکڑتے ہیں، اللہ کے مخالف اس کو بُرے لگتے ہیں، اگرچہ باپ دادا ہوں، بیٹا بیٹی یا پیر اُستاذ۔ دِل میں اللہ کا خوف کچھ ایسا آجاتا ہے کہ ان کی مروّت ہرگز باقی نہیں رہتی اکثر لوگوں نے عمدہ نوکریاں چھوڑ دی ہیں۔ حرام پیشے ترک کر دیئے اور کتنے خانماں سے ہاتھ اُٹھا کر محض اللہ کے واسطے نکل پڑے، اور اس گروہ کے سبب ایک عالم نمازی ہُوا، بلکہ اس گروہ کو دیکھ کر گمراہ کرنے والے بھی اپنے معتقدوں کو نماز کی تلقین کرنے لگے کہ ہمارے لوگ کہیں ہم سے نہ پھر جائیں"[2]

---

[1] رسالہ "دعوت" مشمولہ مجموعہ رسائل تسعہ از مولانا ولایت علی عظیم آبادی ص ٦٥

[2] رسالہ "دعوت" از مولانا ولایت علی عظیم آبادی صادق پوری ص ٦٨ ۔

مولانا ولایت علی عظیم آبادی صادق پور کے اس گروہ صادقین کے سرگروہ، امیر اور مربّی تھے جو

مولانا کرامت علی صاحب جونپوری (م ۱۲۰۹ھ) جو خود اپنے وقت کے ایک بڑے مصلح و داعی اور بنگال کے حق میں (جو عرصہ سے صحیح اسلامی زندگی اور اسلامی تعلیمات سے ناآشنا تھا) خدا کی رحمت اور تاثیر و ہدایت میں اس کی ایک نشانی تھے[1] اپنے رسالہ "مکاشفاتِ رحمت" میں سیّد صاحبؒ کا ذِکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اُن کے اوصاف و کرامات لکھنے کی حاجت نہیں، تمام ملک میں مشہور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عامل بالحدیث تھا اور ابھی تک بھی اس کا شعار اور دستور ہے، انھوں نے حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و مقبولیت اور فیض و تاثیر کی شہادت جن بلند الفاظ میں دی ہے وہ اُوپر گذر چکی۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ اپنی مشہور تالیف "صراطِ مستقیم" کے مقدمہ میں سیّد صاحبؒ کا ذِکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

> " اما بعد میگوید عاجز ذلیل الراجی لرحمۃ اللہ الجلیل بندۂ ضعیف محمد اسمٰعیل کہ نعم الٰہی دربارۂ ایں ضعیف نامتناہی است، واز اعاظم آں حضور محفل ہدایت بنزل ملازماں فخر خاندان سیادت، مرجع ارباب ہدایت، مرکز دائرہ ولایت، دلیلِ سبیل فلاح و رشاد رہنمائی طریق استقامت و سداد، مظہر انوار نبوی، منبع آثار مصطفوی، سلالۂ خاندان صلب طاہر سیّد الاولیا اعنی علی مرتضیٰ، نقادہ دودماں سبط اکبر سند الاصفیا اعنی حسن مجتبیٰ، مقتدائی اصحاب شریعت، پیشوائے ارباب طریقت، ہادی زمانہ، مرشد یگانہ سراج المحبین، تاج المحبوبین، الامام الاوحد السیّد احمد متع اللہ المسلمین بطول بقائہ ونفعنا وسائر الطالبین باقوالہ وافعالہ واحوالہ"۔

[1] راقم سطور نے خود نواب بہادر یار جنگ کی زبان سے ایک تقریر میں سُنا کہ میری معلومات یہ ہیں کہ مولانا کرامت علی کے ذریعہ بنگال میں جن لوگوں کو ہدایت ہوئی، ان کی تعداد دو کروڑ کو پہنچتی ہے۔

ہیں۔ اِس سے بڑھ کے کیا کرامات ہوں گی کہ اس ملک کے مردوں عورتوں میں نماز روزہ خوب جاری ہو گیا اور آگے ہندوستان کے پیرزادوں اور مولویوں سے لے کے عوام لوگوں تک کی عورتوں میں نماز کا چرچا بھی نہ تھا اور اب بالکل ہر قوم کی عورت مرد نماز میں مستعد ہو گئے ہیں، قرآن شریف کا صحیح اور با تجوید پڑھنا اور قرآن شریف کا حفظ خوب جاری ہو گیا ہے، اور حافظوں کی کثرت ہوئی ہے، یہاں تک کہ عوام لوگوں کی عورتیں حافظ ہوئیں اور دیہات اور شہروں میں لوگ حفظ کر رہے ہیں اور پرانی مسجدیں آباد ہوئیں اور نئی مسجدیں بننے لگیں۔ ہزاروں آدمی مکّہ مدینہ کے حج اور زیارت سے مشرف ہوئے اور شرک اور بدعت اور کفر کی رسم اور خلافِ شرع کام سے لوگ باز آئے اور سب کو دین کی تلاش ہوئی اور دینی کتابیں جو نادر اور کمیاب تھیں سو شہر گاؤں میں ہر کہیں گھر گھر پھیل گئیں اور حقیقت میں حضرت سیّد احمد صاحب اس زمانہ کے سارے مسلمانوں کے مرشد ہیں۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، جانے یا نہ جانے، مانے یا نہ مانے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے مجدّد کیا ہے، اس کے طریقہ میں داخل ہونا دین میں مضبوطی کی نشانی ہے"[1]

بعض مغربی مصنّفین کا اعترافِ حق

متعدد مغربی مصنّفین اور اہلِ قلم نے بھی (ان غلط فہمیوں یا بالارادہ غلط بیانوں کے ساتھ جس کے بعض نمونے اوپر گذر چکے ہیں) سیّد صاحبؒ کی تحریکِ اصلاح و جہاد اور انکی

---

[1] "مکاشفاتِ رحمت" از مولانا کرامت علی جونپوری

تعلیم و تربیت کے گہرے اور دیرپا اثرات اور ان کے مقاصد کی وسعت و عظمت کا اعتراف کیا۔ زمانۂ حال کا ایک مغربی مصنّف (WILFRED CANTVELT SMITH) جس نے ممالکِ اسلامیہ میں پیدا ہونے والی تحریکوں اور اداروں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے اپنی کتاب (ISLAM IN MODREN HISTORY) میں لکھتا ہے:

> " لیکن تحریک کا نصب العین اور اس کی قوّتِ محرّکہ زیادہ دیرپا اور زیادہ ہمہ گیر طریقہ پر باقی رہی، کافر کو نکال باہر کرنے کی سعی دبائی جا سکتی تھی اور دبا دی گئی، مگر مسلم سوسائٹی کے اقبال کو بحال کرنے کے لیے اس کے احیاء اور تجدید کی کوششیں باقی رہنی تھیں، جس سے ضمنی طور پر دونوں مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اس کے ذریعہ اسلامی طاقت کا تصوّر بیسویں صدی میں باقی رہا اور معاشرہ پر منڈلاتا بلکہ اسے متحرک کرتا رہا"۔ [1]

(P. HARDY) اپنی کتاب (THE MUSLIM IN BIRTISH INDIA) میں لکھتا ہے:

> " سید احمد بریلوی کا مقصد مغلوں یا مغل اشراف کی بحالی نہیں، بلکہ ہندوستان کی سرحد پر قرنِ اولیٰ کی اسلامی سوسائٹی کا ایک نمونہ پیش کرنا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ یہ نمونہ مسلمانوں کو ایسا فیضان بخش سکتا ہے کہ ایک دن وہ ہندوستان کو اللہ کے لیے فتح کر لیں گے۔ ان کے پیغام نے اعلیٰ طبقوں کو نہیں بلکہ ہندوستان کی مسلم سوسائٹی کے نچلے طبقات کو متاثر کیا۔

---

[1] NEW YARK 1957, P. 53

صنعتی سوسائٹی قائم ہونے سے قبل یہ نچلے طبقے چھوٹے زمیندار، شہروں اور دیہاتوں کے مولوی، اساتذہ، کتب فروش، دکاندار چھوٹے سرکاری ملازم اور کاریگر تھے"۔[1]

نائب رسول و امام کامل

اب شاید وقت آچکا ہے کہ اس عظیم مجدد و مصلح کی شخصیت کو (جو طویل صدیوں کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے) تاریخ اسلام کے چوکھٹے میں صحیح جگہ دی جائے اور اصلاح و تجدید، فکر اسلامی اور جہاد و قربانی کی تاریخ میں ان کے مقام اور مرتبہ کا تعین پوری صحت، وقت نظر، احساس ذمہ داری، اور ایک ملی امانت کی حیثیت سے کیا جائے اور انکی عظمت کے مختلف[2] پہلو اُن کے حقیقی اور اعلیٰ مقاصد اور اصلاحی اور جنگی منصوبے اور نقشے، ان کی عالی ہمتی اور اولوالعزمی اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت و تدبر کے اعلیٰ اوصاف کو اجاگر کیا جائے جو ابھی تک پورے طور پر روشنی میں نہیں آئے اور جن پر اتنے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں کہ ان کی اصل تابانی سے عالم اسلام پوری طرح فیضیاب نہیں۔

جس شخص کو اس آیت قرآنی کی روشنی میں دین کا صحیح فہم حاصل ہو :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ   خدا نے ان مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ

---

[1] CANAIDY 1972, P. 58

[2] اس سلسلہ میں سب سے وقیع اور نفیس کتاب جس سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ بہت اختصار کے ساتھ بلکہ اشارہ اور کنایہ کی زبان میں، وہ ملت اسلامی ہند کے ایک فرد فرید مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیف "منصب امامت" ہے اور اپنے موضوع پر بے مثل کتاب ہے۔

بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ	ان میں انھیں میں سے ایک پیغمبر بھیجے
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ	جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ	اور ان کو پاک کرتے اور خدا کی کتاب اور
وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي	دانائی سکھاتے ہیں اور پہلے تو یہ لوگ
ضَلَالٍ مُّبِينٍ (آل عمران-۱۶۴)	صریح گمراہی میں تھے۔

اور جس کی نظر میں دین کے وسیع آفاق، اس کی گہرائیاں اور اس کے وہ اعلیٰ مقاصد ہوں جو عقیدہ و عبادت، اخلاق و سلوک، تزکیہ و تربیت، اللہ تعالیٰ سے گہرے اور مستحکم تعلق، قرآنی اور ایمانی اخلاق و کردار، اخلاص و للّٰہیت اور خلافتِ راشدہ کے نقشے پر عادلانہ اور عارفانہ سیاست و انتظامِ ملکی سب پر حاوی ہیں اور اس نے اسلام کو اس صورت و معنی میں سمجھا ہو جس صورت و معنی میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے اصحاب کرام اور تابعین نے سمجھا اور پیش کیا تھا نہ کہ اس منقسم اور جزئی شکل میں جس نے اس کو ظاہر و باطن، جسم و رُوح، دین و سیاست میں بانٹ دیا ہے، نہ اس بدلی ہوئی بدنما شکل میں جو مغربی فلسفوں، مغربی طرزِ فکر اور غیر شعوری ردِّ عمل کے نتیجے میں عمل میں آئی ہے، ایسا شخص البتّہ ایسی اہم اور مایۂ ناز شخصیت کے ساتھ ضرور انصاف کرے گا اور اس کو تاریخِ اسلام کی اسی صف میں رکھے گا جو اسلام کے یگانہ اور یکتائے زمانہ ائمہ ہدایت، مجدّدینِ دین اور مجاہدینِ اسلام کے ساتھ مخصوص ہے۔

سیّد احمد شہیدؒ کی سیرت اور ان کا فہمِ دینی اور اس کو دعوتِ اسلامی کی حقیقی و اوّلین شکل میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش دراصل قرآن کے عمیق مطالعہ کا عکس اور سیرتِ نبویؐ اور عشقِ رسولؐ کا حسین و جمیل پرتو ہے جو ان کے گوشت و پوست میں خونِ حیات کی طرح پیوست اور جاری و ساری تھا، اور اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو

اس عہد اور معاشرہ کے لیے خصوصی طور پر تیار اور اس منصبِ عظیم پر مامور کیا تھا جس کو کسی ایسے عظیم مصلح کی شدید ضرورت تھی جو اپنے صدق و اخلاص، حسنِ نیت، صفائی قلب، طہارت باطنی، بے لوثی و بے غرضی، اغراضِ دنیاوی، شوقِ نام آوری اور شہرت طلبی سے سخت نفرت و کراہت، اللہ تعالیٰ کے دربارِ عالی میں کثرتِ دعا اور اظہارِ عاجزی و لاچاری جیسی وہبی صلاحیتوں اور نعمتوں سے کام لے کر اس کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک سکے اور اس کی سرد رگوں میں نیا جوش مارتا ہوا خون ڈال سکے اس لیے ان کو عام قومی و ملی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں، بانیانِ حکومت و سلطنت، فاتحین و کشور کشاؤں، جماعتوں و تحریکوں کے مؤسسین (FOUNDERS) پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

جس کو ترک و اختیار، احساسِ حسن و قبح، اخلاق و عادات، عبادت و دعا، سیاست و حکومت میں ذوقِ نبوی یا ذوقِ محمدی کا کچھ اندازہ ہے اور وہ اس طرزِ خاص کا ادا شناس ہے جس کو ہم مزاجِ نبوت کہہ سکتے ہیں اور جس میں تمام انبیاء شریک ہیں وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ ان کے سینوں میں درد و سوز کی کون سی آگ سلگتی ہے، ان کی روح کس لیے بے چین ہوتی ہے، ان کی راتوں کی نیند کیوں حرام ہوتی ہے —— دن میں وہ کس لیے دیوانہ وار پھرتے ہیں اور صبح و شام سے بے پرواہ ہو کر اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، وہ کیا چیز ہے جو اُن کے دلوں کے سوتوں کو روانی بخشتی ہے، وہ کیا درد ہے جو اُن کی آنکھوں کو اشکبار کرتا ہے، وہ کیا "اکسیر" ہے جس سے ان کی زبان سرچشمۂ حکمت بن جاتی ہے اور اُنکے سیدھے سادھے اور مختصر جملوں سے پتھر موم ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے معاند اور گمراہ چشم زدن میں راہِ ہدایت پر آجاتے ہیں۔

جو ایک دفعہ اس ذوق کو سمجھ لے گا اور اس راز سے آشنا ہو جائے گا اس کے ہاتھ میں وہ "شاہ کلید" آجائے گی جس سے اس شخصیت کا قفل آسانی سے کھل سکتا ہے جو بہت

سے قارئین کے لیے اب بھی ایک رازِ سربستہ اور بہت سے اُن اہلِ قلم اور اصحابِ فکر و تحقیق کے لیے چیستاں ہے جو مادّی ذہن کے غلبہ اور عصرِ حاضر کے معروف تصوّرات اور مخصوص پیمانوں کے اثر اور گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہیں۔

والله یهدی من یشاء الی   اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم
صراط مستقیم   کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔

آپ کی امامت و قیادت اپنے وقت کی وہ آزاد زندہ اور حقیقی امامت و قیادت تھی جس کی طرف ہر زمانہ میں مسلمانوں کے بالغ نظر حکماء و مبصرین کی آنکھیں لگی رہیں جس کے انتظار میں چرخِ کہن سینکڑوں کروٹیں بدل چکا، جو مسلمانوں کے درد کا واحد درماں اور اسلام کے حق میں پیغامِ حیات ہے۔ اس امامت کی حقیقت ہمارے زمانے کے حکیم شاعر ڈاکٹر اقبال نے بیان کی ہے ؎

تُو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مُجھ سے   حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق   جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست   زندگی اور بھی تیرے لیے دُشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہُو گرما دے   فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی   جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے [1]

المکتبة الرحمانیة
۹۹ ... بے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر ... 06852

---

[1] ضربِ کلیم

06852